گنجہائے گرانمایہ

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

(غالب)

فہرس

L 6598

ولادت تو مادر زاد ہوتی ہے لیکن محمد علیؒ کی موت خانہ زاد تھی۔ عام طور پر موت اپنا انتخاب خود کرتی ہے لیکن محمد علی نے خود موت کا انتخاب کیا اور یہی وہ چیز ہے جس نے محمد علی کی زندگی اور موت دونوں کو ایک حقیقت بنا دیا —— سنگین اور صالح!

محمد علی کی زندگی اور موت دونوں ان کی انفرادی اور شخصی افتادِ طبع کی ایک جلوہ گری تھی۔ اور شخصیت کی اسی جلوہ گری کا نام آرٹ ہے —— صحیح اور گرانمایہ!

محمدؐ علی کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز تھے کس کی زندگی میں نہیں ہوتے لیکن ان کی موت نے ہر نشیب کو فراز اور ہر فراز کو پُرشوکت بنا دیا۔

محمد علی کو بد توفیقوں اور بد مذاقوں سے سابقہ پڑا، ایسے بد توفیق اور بد مذاق جو بھوکے تھے بوالہوس اور اکثر کینہ پرور بھی۔ محمد علی نے ان سب سے انتقام بھی لیا، لیکن اپنی زندگی میں نہیں بلکہ اپنی موت سے!

محمد علی کے باب میں بعض کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ یہ تنگدلوں اور تنگ نظروں کا فیصلہ ہے۔ مردِ غازی کے کارنامہ کا اندازہ مقبوضات کی وسعت، مالِ غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی ہمہمی و طرب انگیزی، تمغہ اور اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے، ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، ولکتی ہوئی روح، اور دمکتے ہوئے چہرہ ——— ڈوبتے ہوئے سورج سے!

محمد علی کا قلب حزیں تھا لیکن روح امر ربی ——— بشارت ازلی بھی۔ حزیں یوں کہ جن کو وہ محبوب رکھتے تھے وہ بھی ان کے مخالف تھے۔ کیسی مخالفت اصولی نہیں بلکہ اکثر ذاتی مفاد، نفس پروری اور تن آسانی کے تحفظ کے لئے۔ وہ ایک شیر کی مانند تھے جس کو شیروں سے نہیں بلکہ لومڑی اور بھیڑیوں سے سابقہ ہو۔ بشارت ازلی اس لئے کہ شخصیت کامیاب رہی۔ شخص کا انجام ناقابلِ التفات۔ افراد کی ناکامی، حق کی کامیابی کی دلیل ہے ——— روشن اور محکم!

محمد علی کی ذہانت اور فطانت اب کہاں ملے گی۔ وہ تیغ اصیل تھی جو رزم میں بے پناہ تھی اور بزم میں ایک جلوہ گری۔

وہ مخالفت اور مقابلہ میں بے باک اور بے پناہ تھے۔ اپنے چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے ان کو پناہ دیتے تھے۔ ان کی دل دہی اور دل آسائی کرتے۔ ان کے لئے مارنے مرنے پر تیار رہتے محمد علی کی آغوش میں رحمت تھی۔ ان سے مدد لینے کے معنی یہ تھے کہ اب ساری ذمہ داری، ساری فلاکت و ہلاکت محمد علی کی اور کامیابی یا شہرت مدد لینے والے کی!

وہ آغوشِ مادر، بازوئے برادر اور دستِ عزیزاں تھے!

کس بلا کے بولنے اور لکھنے والے تھے۔ بولتے تو معلوم ہوتا کہ ابوالہول کی آواز اہرام مصری سے ٹکرا رہی ہے، لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کرپ کے کارخانے میں توپیں ڈھلنے والی ہیں۔ یا پھر شاہ جہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے۔ میں نے ان کو اسٹیج پر آتے اور بولتے ہوئے سنا ہے اور خود محمد علی کو داد دینے سے پہلے انہیں کو داد دی ہے ؎

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے!

محمد علی پر روپئے اور شہرت کی بارش ہوتی اور محمد علی نے ان دونوں کو سیلاب بنا کر بہا دیا۔ دونوں نے مفارقت کی۔ بدنامی اور مفلسی سے بھی سابقہ پڑا لیکن یہ چیزیں جسم و جان کی تھیں۔ ان کی روح پاک تھی ——— ظاہر کیا معلوم زندہ رہتے تو کیا ہوتا۔ بوریائے بوذرؓ اور سریرِ سلیمانؑ کو یکساں سمجھنے والی کی موت آخر کیا شہادت دیتی ہے!

محمد علی کی موت کا حال جب میں نے سنا تو تھوڑی دیر کے لئے سکتے میں آ گیا اور رہ رہ کر یہ خیال آتا رہا کہ محمد علی کو آخر موت نے زیر کس طور پر کیا ——— خود موت پر کیا گزری ہوگی۔

پھر سوچنے لگا کہ اگر محمد علی کی بجائے قضا و قدر یہ چارۂ کار پیش کرتے کہ اچھا محمد علی کی بجائے ہندوستان کے کسی مسلمان لیڈر کو حوالہ کر دو۔ یہ سوال آتے ہی خدا جانے یہ فیصلہ دل میں کیسے آیا۔ اور انتہائی قطعیت کے ساتھ کہ محمد علی کے بدلہ میں ہندوستان کا بڑے سے بڑا لیڈر دیا جا سکتا تھا اور اس کا ماتم نسبتاً کم ہوتا!۔

لوگ آزردہ نہ ہوں، انسان کے دل میں عجیب عجیب خیالات آتے رہتے ہیں انہیں خیالات کو کبھی الہام قرار دیا جاتا ہے اور کبھی یہ صرف مہمل بھی ہوتے ہیں لیکن خیال کے عجیب تر ہونے کی معنی ہمیشہ مہمل یا مہمل تر ہونے کے تو نہیں ہیں۔

محمد علی میں کمزوریاں بھی تھیں لیکن کمزوریاں نہ ہوتیں تو آج کل کے مسلمان لیڈر مصطفےٰ کمال، اور برطانوی شہنشاہیت پر کیا گزر جاتی!۔

ملک و ملت کی جنگ اب بھی جاری ہے لیکن نعرۂ جنگ خاموش ہے۔ فتح و شکست تو اسی لئے بناتے گئے ہیں کہ فتح و شکست ہوتی رہے لیکن جنگجو کہاں ہے، شہادت کس کو نصیب ہوگی، ایسا حسینؓ کہاں جس کی خود یزید کو تلاش ہو!

آیئے جہاں کل فاتح بیت المقدس نے سر جھکایا تھا وہاں آج محمد علی کی معراج منائیں!!

ڈاکٹر انصاری مرحوم

سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم

ڈاکٹر انصاری موجود تھے اور کسی کے مرنے کی خبر سننے میں آتی تھی تو سوال فوراً زبان پر آتا تھا ڈاکٹر انصاری کو بھی دکھایا تھا؟ اب جب کہ ڈاکٹر انصاری کی رحلت کی خبر آتی تو تھوڑی دیر تک عقل و حواس معطل رہے، سوچنے لگا آخر ڈاکٹر انصاری کیونکر جاں بحق ہوئے اور یہ کیونکر ممکن ہوا کہ وہ خود اپنے لئے اس موت کا سدِ باب نہ کر سکے جس کو ان کی نتھری، چمکیلی، گہری اور مریض اور تندرست دونوں کو تسکین دینے والی آنکھیں ہمیشہ روک دیتی تھیں ٹال دیتی تھیں اور بھگا دیتی تھیں۔

میں ہمیشہ مریض رہا اور ڈاکٹر انصاری سے اپنی تکلیف رجوع کرتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ میرا مرض معمولی مرض نہیں ہے اور اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ ایسی حالت میں جب ذہن کی فضا ایسی مٹیالی، نمناک اور غلیظ ہو جاتی جس کو میں اس طرح چھو سکتا تھا جیسے گلی سڑی پھپوندی

کو اس وقت میں اُن کے مطلب کا رُخ کرتا۔ انتظار میں اکثر زیادہ وقت صرف ہوتا اور میں اُن
کے انتظار کے کمرہ میں بیٹھا، فتحپوری کی دکانوں، گزرنے والوں کی تگ ودو، گاڑیوں اور
پھیری والوں کے شور و شغب دیکھتا اور سوچتا کہ یہ چہل پہل، یہ لہر بہر، یہ مشغولیت، یہ غلغلہ، زندگی
ہے جس سے میں ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دیا جاؤں گا، زندگی ہی وہ کل ہے جو اپنے جزو سے مستغنی
ہے تو مجھ پر ہراس، مایوسی اور اکثر بغاوت کا جذبہ طاری ہو جاتا۔ اور میں زیادہ بیتابی کے ساتھ
ڈاکٹر صاحب کا منتظر ہو جاتا۔

اتنے میں ڈاکٹر صاحب کی آمد کی خبر آتی، وہ اپنے مضبوط اور ہموار قدموں سے زینہ پر
چڑھتے اور کسی ہمراہی سے گفتگو کرتے ہوئے سنائی دیتے، دیکھتے ہی مسکراتے اور اس طور پر
کہ گھنی پلکوں کے نیچے سے اُن کی آنکھیں بھی مسکرانے لگتیں، کہتے بھئی تم کہاں بڑے عرصہ
تک غائب رہے، میں کہتا ڈاکٹر صاحب بڑی تکلیف ہے، پریشان ہوں کچھ کرنے دھرنے
نہیں بنتا۔ بولتے گھبراؤ نہیں ابھی دیکھتا ہوں، پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ باتیں
اس لب و لہجہ سے اور اس طرح ہنس ہنس کر اعتماد اور اعتقاد، دل آسائی اور دلربائی کے ساتھ
دوستی اور بزرگی کی شان سے کہتے کہ مجھے خود محسوس ہونے لگتا کہ میں ناحق پریشان ہوا۔ اس
سے پہلے کیوں نہیں آیا۔ خواہ مخواہ اتنے دنوں مصیبت و مایوسی میں کیوں مبتلا رہا۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا اس سے بات کرتے جاتے، انداز گفتگو
سے محسوس ہوتا کہ وہ دوسرے سے بات اس لئے کر رہے ہیں کہ مجھے تقویت پہنچے اور مجھ
سے گفتگو کرتے تو اوروں کو محسوس ہوتا کہ وہ دوسروں میں بھی اعتماد اور اُمید کی روح بیدار
کر رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ صرف مریض یا اُن کے اعزا نہ ہوتے بلکہ مختلف اقسام کے لوگ ہوتے
مقاصد کی نوعیت بھی جداگانہ ہوتی، لیکن ڈاکٹر انصاری کی بات میں وہ جادو تھا کہ ہر شخص

یہی سمجھتا کہ گو ڈاکٹر انصاری مخاطب دوسروں سے ہیں لیکن کہہ وہی رہے ہیں جو ہماری تقویت یا دلچسپی کا موجب ہو۔

ڈاکٹر انصاری اپنے معائنہ کے کمرہ میں لے جاتے، مجھے اس قسم کے معائنہ خانوں اور آپریشن روم وغیرہ میں جانے کا اکثر اتفاق ہوا ہے لیکن جس امید اور اعتماد کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر بھاٹیہ لکھنؤ کے حوالہ کیا ہے وہ مجھے کہیں اور نصیب نہ ہوا۔ ڈاکٹر انصاری اس طرح دیکھتے ٹٹولتے گویا وہ خود اپنے زخم یا درد کو ٹٹول رہے ہیں۔ اُن کی انگلیاں، خوبصورت، سڈول، گداز، پاکیزہ خوش رنگ اور ایسی معتدل حرارت کی ہوتیں اور اُن کو وہ اُس نرمی اور نزاکت کے ساتھ کام میں لاتے کہ مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ کسی دوسرے کی انگلیاں میرے جسم کو چھو رہی ہیں۔ آہ ان کی گھنی ابروئیں اور لمبی پلکوں والی، گہری، روشن اور ہلتی ہوئی آنکھیں اور شیر و شہد سی نگاہیں جو جسم و جان ہیں اس طور پر نفوذ کرتیں جیسے کوئی اچھا خیال یا اچھا کام قلب کو بالیدہ جذبات کو رنگین اور خیالات کو بلند کر دیتا ہے وہ مریض کا معائنہ ایسے کرتے جیسے وہ اُن کا جان چھڑکنے والا بھائی چہیتا بیٹا یا جاں نثار دوست ہے۔ اُن کی پیشانی ایک روشن فضا تھی جس میں مریض کو امید اور بر آنے والی امید کے نقوش نظر آتے تھے۔ معائنہ کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا گویا ڈاکٹر انصاری کو آج تمام دن کوئی اور کام کرنا نہیں ہے اور سب ہی مریض پر تمام وقت اور توجہ صرف کر دیں گے۔ معائنہ ختم کرنے کے بعد میز پر لیٹے ہوئے مریض کو خود سہارا دے کر اٹھاتے۔ کچھ دیر تک اسے میز پر پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھا رہنے دیتے اور خود اس کے پاس کھڑے ہو کر اس طور پر باتیں کرتے جیسے اپنے کسی گہرے بے تکلف دوست سے خوش گپی کر رہے ہوں۔ اس کے بعد [illegible] کپڑے اتارنے سکپڑے پہنانے میں مدد دیتے، نسخہ لکھنے، استعمال کی ترکیب بتاتے اور

رخصت کر دیتے۔

ڈاکٹر انصاری سے رخصت ہو کر میں اپنے آپ کو بالکل تندرست سمجھنے لگتا۔ اگر مرض کی کچھ تکلیف بھی ہوتی تو سمجھتا کہ دوا استعمال کرنے کے بعد ہی جاتی رہے گی۔ چنانچہ میں مطب سے اترتے ہی فتحپوری اور چاندنی چوک کی چہل پہل اور ہجوم ہی میں گم ہو جاتا۔ پھل والوں کے ہاں سے پھل خریدتا اور کسی ہوٹل میں جا کر کھانا کھاتا اور مدتوں پرہیز کرتے کرتے کھانے پینے کا جو لطف کھو چکا ہوتا اس کو بدپرہیزی سے از سر نو حاصل کرتا۔ دل کا اندوہ چھٹ جاتا اور زندگی خوشگوار اور خوش آیند معلوم ہونے لگتی۔

میں نے ایک بار ڈاکٹر انصاری کو سرجری کرتے بھی دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ماہر مصور کے ہاتھ میں موقلم ہے یا کوئی مرصع ساز کسی نازک زیور یا مشین پر کام کر رہا ہے۔ نشتر اُن کی انگلیوں میں اس طور پر کام کرتا جیسے بہزاد اپنے قلم سے خطوط کھینچ رہا ہے۔ نزاکت اور صلابت دونوں کا امتزاج، ایسا امتزاج جو قوس قزح کے رنگوں میں پایا جاتا ہے، چہرہ پر سنجیدگی، آنکھوں میں گہرائی، انگلیوں میں صفائی اور تیزی۔ آپریشن میں آلودگی کا ہونا لازمی ہے لیکن ڈاکٹر انصاری کو آپریشن کرتے دیکھتے تو معلوم ہوتا جیسے مشین کا ماہر مختلف ٹکڑوں کو جو آسکریو سے جڑے ہوں، خوبی پھرتی صفائی اور اعتماد کے ساتھ علیحدہ کر رہا ہے۔

مدتیں گزریں میری طفولیت اور الہلال کے شباب کا زمانہ تھا۔ الہلال کے جتنے پرچے آتے تھے ہم لوگ اس کو شوق اور عقیدت سے پڑھتے تھے۔ عبارت سمجھتے تو فخر کرتے اور جہاں نہیں سمجھتے تھے وہاں یہ خیال کرتے تھے کہ کوئی بڑی بلند یا گہری بات کہی ہے جو ہماری سمجھ سے باہر ہے اس لئے اس کا احترام اور زیادہ کرتے تھے۔ پچھلی بار گھر گیا بچپن کی الماری گرد و غبار سے اٹی پڑی ہوئی تھی۔ ایک پر اتفاقیہ نظر جا پڑی۔ دیکھا تو اس وفد کی تصویر تھی جو ڈاکٹر انصاری مرحوم کی سرکردگی

میں یہاں سے جنگ بلقان میں زخموں کی مرہم پٹی کے لئے گیا تھا۔ یہ تصویر اس زمانہ میں الہلال میں شائع ہوئی تھی نیچے لکھا ہوا تھا۔

"اے وہ لوگو کہ زخمیوں کے ملک میں جا رہے ہو جب وہاں پہنچنا تو خدارا اُن کے زخموں پر سختی نہ کرنا کیونکہ وہ زخم جسم ان کے نہیں ہیں بلکہ اسلام کے ہیں"۔

آہ وہ زمانہ یاد آگیا جب ابوالکلام، محمد علی، ڈاکٹر انصاری کو ہم سب خدا جانے کیا سمجھتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ اسلام پر تیرہ سو برس نہیں گزرے ہیں۔ بڑے ہو کر ہم بھی ہندوستان سے باہر جا کر مسلمان مجاہد کی طرح لڑیں گے، زخمی ہوں گے شہادت پائیں گے فاتح کہلائیں گے۔ دُنیا دیکھے گی کہ اسلام اور اسلامیوں سے بڑھ کر کوئی نعمت اور منزلت نہیں ہے۔

آج جب کہ یہ سطور لکھ رہا ہوں ماضی کا غبار زندگی کی شاہراہ سے ہٹ گیا ہے اور تصور کی کرنیں طفولیت کے اس افق پر پڑ رہی ہیں جہاں ہم رہ رہ کر تلملا اٹھتے تھے کہ کیوں بچپن کا زمانہ نہیں ختم ہوتا۔ اور ہم ترکوں کی مدد کے لئے۔ اسلام کا نام روشن کرنے کے لئے، زخمی ہونے کے لئے سپاہیوں کی صف میں کھڑے ہونے کے لئے کیوں نہیں بلائے جاتے لیکن اب کیا حال ہے، ہم بدل گئے زمانہ بدل گیا، دُنیا بدل گئی، رنج و راحت، عزت و ذلت کا تصور بدل گیا۔ زندگی کی جدوجہد وہی ہے لیکن جدوجہد کا لطف باقی نہیں رہا۔ تصورات میں نہ رنگینی باقی رہی نہ حرارت، عزائم میں نہ استواری ہے اور نہ برکت! مانا موجودہ عہد کے مسائل اور مطالبات کچھ اور ہی ہیں فرائض اور ذمہ داریاں بھی بدلی ہوئی ہیں لیکن خدارا کوئی یہ بتاتے یہ کیسے مسائل ہیں یہ کیسے فرائض ہیں جن سے دماغ میں روشنی نہیں پیدا ہوتی دلوں میں ولولے نہیں پیدا ہوتے، ہاتھوں میں قوت نہیں پیدا ہوتی اور زندگی سے حرارت مفقود ہو چکی ہے۔

ظاہر ہے میں پرانے وقتوں کا ہوں راگنی بے وقت کی ہے، زمانہ ترقی کر چکا ہے، زندگی اور

زندگی کے تار و پود نئے اسلوب سے مرتب ہو رہے ہیں۔ ہر چیز کی قدر و قیمت گھٹ بڑھ رہی ہے۔ جس چیز کو ہم متاع یوسفی سمجھتے تھے وہ متاع کاسد سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور جسے اب دیکھ کر ہم خجل اور سراسیمہ ہوتے ہیں وہی حاصل حیات ہے۔ زمانہ اور زندگی کی رفتار ہی نہیں اس کا رُخ بھی بدل گیا ہے لیکن زندگی کی ہمہ ہمی کو حقائق کا انکشاف کیوں کہئے۔ سائنس کے کرشموں کو انسانیت کا معجزہ کیوں بتایا جاتا ہے۔ آرٹ اور آزادی کی قربان گاہ پر کن چیزوں کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے افراد کی شادمی و غمی کیا ہو گی، ان کی پروا کیوں نہیں کی جاتی۔ جماعت کے ریگ زار سے افراد کی اُمید اور امنگ کے نخلستان کیوں فنا کئے جا رہے ہیں۔ یہ سب بے وقت کی راگنی صحیح رنج و راحت کا تصور اور وہ بھی درست لیکن رنج و راحت کا احساس کیونکر بدل گیا؟

ڈاکٹر انصاری ہندو مسلمانوں کے نفاق و افتراق کو دور کرنے کی فکر میں تمام عمر پریشان رہے۔ وہ نفاق و افتراق کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مرض سمجھتے تھے اور ایک سچے طبیب اور ڈاکٹر کی مانند مریض سے ہمدردی کرنے اور مرض کے ازالہ میں پوری توجہ اور دلسوزی اور قابلیت صرف کرتے رہے۔ انھوں نے ہندو مسلم اختلاف کو ہندو یا مسلم کی حیثیت سے نہ کبھی پرکھا اور نہ اس کی چارہ سازی کی۔ انھوں نے اس مرض کے ازالہ کی ایک حقیقی طبیب کی حیثیت سے کوشش کی۔ ڈاکٹر انصاری کے لئے اس کے علاوہ اور چارہ کار ہی نہ تھا۔ وہ جب کرتے جو کچھ کرتے اور جو کچھ کر سکتے سب ڈاکٹر کی حیثیت سے کرتے اور ایسا ہی انھوں نے کیا۔

ڈاکٹر انصاری کی وفات سے کتنے اٹھنے والے ایمان یتیم ہو گئیں۔ بیوائیں لاوارث ہو گئیں۔ نوجوان بے دست و پا ہو گئے۔ نقاد بے تیور ہو بیٹھے۔ وہ معلوم نہیں کن کن مواقع پر کیسے کیسے لوگ

کی مدد کر چکے تھے اس بڑے پہیئے کی گردش سے کتنی چھوٹی چھوٹی اور مختلف متفرق مشینیں گردش کر رہی تھیں۔ وہ محتاجوں ہی کے مددگار نہ تھے بلکہ ان لوگوں کی آن بان اور وضعداری کے بھی کفیل تھے۔ جن کو آسیاے گردش ایام برابر پیستی جاتی تھی۔ ایسوں کی دستگیری معمولی کام نہ تھا۔ دولت، اثر، اقتدار کا کتنا بڑا حصہ ان پر صرف ہوتا ہوگا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے ہر قسم کی مدد، انتہائی کشادہ جبینی اور دریا دلی کے ساتھ دوسروں کی کی ہوگی۔ اور شاید کوئی ایسا نہ ہو جس سے اپنی نوعیت کی مدد ڈاکٹر انصاری نے حاصل کی ہو۔

انہوں نے خوب کمایا، خوب صرف کیا، ان پر ایسے ایسے مواقع بھی آتے جب اُن کے پاس کھانے اور صرف کرنے کو کچھ نہ تھا۔ لیکن اُن کی زندگی میں کسی ایسے کو، جس کے کفیل ڈاکٹر انصاری تھے، کبھی کسی ایسے موقع سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ جب اس کو کھانے اور خرچ کرنے کی سختی جھیلنی پڑی ہو۔ ایسے لوگوں کی تعداد کم نہ تھی۔ ڈاکٹر انصاری کے رفقا میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جس نے ڈاکٹر انصاری کی اتنی مدد کی ہو جتنی ڈاکٹر انصاری نے اس کی کی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ لوگ جن پر ڈاکٹر کے احسانات تھے ڈاکٹر کے لئے کیا کرتے ہیں۔ ڈر صرف اسی سے ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان اکثر و بیشتر صرف یہ کرتے ہیں کہ مدد لیتے ہیں تو حق ناحق کی بھی تمیز اٹھا دیتے ہیں لیکن مدد دینے کے وقت اُس حالت کو یکسر فراموش کر جاتے ہیں۔ جب خود ہم کو مدد مانگنے کی ضرورت ہوتی تھی اور ہماری مدد کی گئی تھی۔

ڈاکٹر انصاری جامعہ ملیہ کے قیام و ترقی میں جو کچھ کرتے رہے اور اُن کی جوابدہی اور دل اس سے وابستہ تھے اس کا اندازہ میں کر سکتا ہوں۔ غالباً چند ہی لوگ ایسے ہوں گے جو مجھ سے زیادہ اس کا احساس کر سکتے ہوں۔ ابھی ابھی رمضان کی ایک شام کو ڈاکٹر صاحب[1] کے ہمراہ

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ

جامعہ کی نئی عمارت "دیکھنے" او "کھلنے" گیا ہوا تھا۔ اور کھلے کے صاف سادے ورق پر ایک نقش
ابھر رہا تھا۔ بدیع اور بلند۔ عمارت کا نقشہ اور اس کا پیکر ابھی نامکمل تھا۔ تصور تصویر میں منتقل
ہو رہا تھا۔ مستقبل کا افق دھیرے دھیرے ان تمام گہرائیوں اور پہنائیوں کے ساتھ بے نقاب ہو رہا
تھا جن میں مومن کا عزم پرورش پاتا ہے، بالیدہ ہوتا ہے اور آفاق پر چھا جاتا ہے۔

عمارت کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک طرف ڈاکٹر انصاری آسودۂ خاک تھے اور بعد فن کے
بہشتی جھروکے سے اپنے حسنات کی فردوس تعمیر ہوتے دیکھ رہے تھے۔

دیر تو رہی تھی ہم سب واپس آ گئے

میرے مولانا

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

مولانا سلیمان اشرف صاحب اس جہان سے اُٹھ گئے اور اپنے ساتھ وہ تمام باتیں لے گئے۔ جو میرے لئے اب کسی اور میں نہیں۔ میرا اُن کا خون کا کوئی رشتہ نہ تھا صرف علی گڑھ کا رشتہ تھا لیکن کس سے کہوں اور کون سمجھے گا کہ اس رشتہ میں کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ وہ میرے لئے عزیزوں سے زیادہ عزیز تھے۔ بزرگوں سے زیادہ بزرگ اور دوستوں سے زیادہ دوست۔ پریشان ہوتا تو ان کے ہاں جاتا۔ جی گھبراتا تو وہاں جاتا۔ خوش ہوتا تو وہاں ضرور جاتا ——
اور جب کہیں نہ جانا ہوتا تو وہاں جاتا۔ گھنٹوں بیٹھتا۔ کوئی معمولی جان پہچان یا تعلقات کا آدمی

پہلے سے موجود ہوتا۔ تو اسے رخصت کر دیتے۔ کوئی اچھا ملنے جلنے والا موجود ہوتا تو اسے اٹھنے نہ دیتے۔ جو کچھ ہوتا اس سے ضرور تواضع کرتے۔ ایسا کبھی نہ ہوتا کہ کوئی چیز موجود نہ ہو مجھے چائے کا شوق نہیں مرحوم اس کے بڑے شائق تھے اور بڑے تکلف سے پیتے۔ اصرار سے ایک پیالی دیتے۔ کہتے پی لو۔ پھر گپ ہوگی۔ ایک پان کھاؤ۔ دوسرا مجھے بنا کر دو۔
میں کہتا آپ کے ہاں چائے میں نہ شکر نہ دودھ۔ فرق کیسی ہوگی؟ کہتے میرے لئے پیتے ہو یا اپنے لئے۔ میں نے دبی زبان سے کہا بیوی بچوں کا بھی تو خیال ہے۔ فرمایا کبھی کبھی بیوی بچوں سے الگ رہ کر بھی زندہ رہ لیا کرو۔ میں کہتا آپ رام پوری تنبا کو کھاتے ہیں۔ یہ میرے بس کی نہیں ہے۔ کہتے چائے میں دودھ شکر اور پان میں خوشبودار تنبا کو کھاتے ہو۔ نشہ کا احترام کرنا نہیں آیا۔ آواز دیتے میاں ارشید کی پیالی میں شکر ڈالنا، پھر پکارتے "بھئی رشید کو تنباکو دو۔ بڑی مزیدار معطر تنباکو ہوتی۔

پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے۔ آج تک یہ نہ پوچھا کیسے ہو، بال بچے کیسے ہیں، کیا کرتے ہو، ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی غیر معمولی بات ہوتی تو میں خود ہی کہتا یا انہیں پہلے سے معلوم ہوتی۔ کبھی انہوں نے مجھے گھر سے بلوا نہ بھیجا۔ کیسی ہی ضروری بات کیوں نہ ہوتی اس کے منتظر رہتے کہ چلتے پھرتے ملاقات ہو جائے گی۔ تو کہہ دیں گے۔ ایسا موقع ہوتا تو صرف چند منٹوں میں بات ختم کر دیتے اور فوراً کہہ دیتے "اچھا جاؤ"۔

مجھے خوب یاد ہے ایک دن میں "دو منزلے" کے سامنے سے بڑی تیزی سے سائیکل سے گذر رہا تھا۔ سامنے چبوترے پر ٹہل رہے تھے، فوراً پکارا ذرا ٹھہرنا، میں رکا سائیکل کو چبوترہ سے لگا کر قریب آنا چاہتا تھا، فرمایا نہیں نیچے ہی کھڑے رہو، ایک بات کہنی تھی، وہ تمہارا یار اصغر (شاعر) اب کے الہ آباد کے سفر میں ساتھ ہو گیا تھا کیا شعر کہا ہے۔

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

اس شعر کو اپنے خاص ترنم، کسی قدر حزیں لیکن پُر وقار لہجہ میں پھر پڑھا کہنے لگے، رشید اس شعر کا کہنے والا کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔ الہ آباد تک ساتھ رہا بڑا کڑھا ہوا آدمی ہے اب کبھی آئیں تو ضرور لانا۔ اس شعر کی خوبی کی تفصیل پھر کبھی سناؤں گا۔ اس وقت جاؤ خوش ہو مرحوم کے ہاں جائیے تو کوئی خاص موضوع گفتگو کے لئے مخصوص نہ ہوتا، باتوں ہی باتوں میں ایسے ایسے فقرے اور لطیفے کہہ جاتے کہ طبیعت باغ باغ ہو جاتی۔ ہر بات بے ضغطہ زبان کہتے "بے ضغطہ زبان" انہیں کا فقرہ ہے، کبھی کبھی ایسے الفاظ اور فقرے بھی کہہ جاتے جو ثقاہت کی زبان پر نہیں آتے لیکن اس بے ساختگی سے اور اتنا برجستہ کہتے کہ اس لفظ کی ثقالت کی طرف ذہن منتقل نہ ہوتا۔ ان کی باتوں میں حلاوت تھی، کبھی کبھی خاص بہار کا کوئی لفظ بول جاتے اور کہہ دیتے کہ یہ خاص ہمارے دیار کا لفظ ہے۔ ایسا جامع لفظ اور کہیں نہ ملے گا۔

کرسی ہو مونڈھا ہو، صوفا ہو، تخت ہو بیٹھتے ایک ہی وضع سے تھے۔ پاؤں اٹھا کر اور سمیٹ کر۔ اسی طرح بیٹھ کر چائے پیتے، مطالعہ کرتے، لکھتے اور باتیں کرتے نشست کا ہر طرح کا سامان ہوتا۔ چبوترے سے متصل نیم دائرہ سائبان میں مونڈھے بچھے ہوتے، ایک طرف چارپائی بھی ہوتی۔ بڑے سے بڑا آدمی بھی کیوں نہ آجاتا اس کے لئے کوئی اونچی کرسی یا صوفا وغیرہ اندر سے نہ نکالا جاتا۔ جو موجود ہوتا اسی پر وہ بھی بیٹھ جاتا اور سارے مجمع کو دیکھ کر یہی معلوم ہوتا کہ مرحوم ہی سب پر چھائے ہوتے ہیں۔ کسی سے آج تک مرحوم نے ایسی گفتگو نہ کی جس سے معلوم ہوتا کہ مولینا نو وارد سے مرعوب ہیں یا اس سے خاص طور پر مخاطب ہیں۔ بڑے سے بڑے نواب کو بھی میں نے مرحوم کے پاس بیٹھے دیکھا ہے اور لوگ بھی موجود ہیں لیکن

مولانا ہر ایک سے ایک اُتار چڑھاؤ سے گفتگو کر رہے ہیں۔ مولانا کا پرانا نوکر حسبِ اسی طرح نواب صاحب کو چائے کی ایک پیالی لا کر دے گا۔ جس طرح وہ مجمع میں کسی اور کو دیتا وہی بے ضعف لہ زبان گفتگو وہی نشست، وہی فضا، جس کا جی چاہا اُٹھ کر چلا گیا۔ اسی دوران میں معزز نو وارد بھی تشریف لے گئے، اور مولانا مرحوم اپنی جگہ پر چوں کے توں باغ و بہار یا کوہ وقار بنے بیٹھے رہے!

زندگی میں ہر طرح کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن اکثر محسوس یہی ہوا کہ مخاطب میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ہے۔ کوئی بڑا مخلص ملا تو اتنا ہی ثقہ اور روکھا پھیکا کوئی ہنسنے ہنسانے والا ہو تو یہ محسوس ہوا کہ اس میں تھوڑا بہت گنوار پن بھی ہے۔ کوئی بڑا عالم فاضل ہوا تو اس میں نخوت تنگ نظری اور کم ظرفی بھی کسی نہ کسی حد تک پائی گئی اللہ والے ملے تو انہیں دنیا کے کام کا نہ پایا۔ کسی منکر خدا کو ایسا نہ پایا جو کچھ اور نہیں رسول کی شرافت و عظمت کا تو قائل ہوتا۔ لیکن مرحوم کی شخصیت اتنی جامع اور متنوع تھی کہ وہ ہر موضوع اور ہر موقع سے اس خوبی سے عہدہ برآ ہوتے کہ ان کی صحبت میں جی لگتا اور کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ فلاں جگہ کمی ہے جسے پورا کرنے کے لئے کسی اور کو ڈھونڈھنا چاہئے۔

میرا اُن کا بیس بائیس سال سے ساتھ تھا۔ پہلے پہل ملا تو علی گڑھ میں نو وارد کس مپرس طالب علم تھا۔ جب ان کا ساتھ چھوٹا ہے تو سب کچھ تھا۔ دوسروں کے نزدیک نہ سہی اپنے نزدیک سہی میں نے بھی اس مدت میں بہت کچھ دیکھا، سُنا اور برتا ہے اور اپنے نزدیک اپنی ہر استعداد پر کچھ نہ کچھ اعتماد بھی رکھتا ہوں لیکن اب غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم نے جو سلوک مجھ سے ابتدا میں رکھا وہی آخر دم تک قائم رہا۔ انہوں نے اپنی خداداد ذہانت و اخلاص سے ہمیشہ وہ سطح قائم رکھی جس کو میں نے اپنے نزدیک اپنی استعداد اور اپنی آرزو کے عین مطابق پایا۔ اسے یوں سمجھ لیجئے کہ مولانا کی صحبت سے جب کبھی اٹھتا تو معلوم ہوتا کہ میں نے

کوئی نئی اور اچھی بات سیکھی یا کوئی نیا اور اچھا جذبہ پیدا ہو گیا۔ پریشان و مایوس ہوا تو ان کی صحبت سے ہشاش بشاش اٹھا، رنج یا غصہ ہوا تو مرحوم کی باتوں سے غم غلط ہو گیا۔ خالی الذہن گیا تھا تو معلومات کے اس نادر و لطیف نکتوں سے بہرہ مند اٹھا جو شاید مدتوں کے مطالعہ یا مشاہدہ سے حاصل نہ ہو سکتے۔

آج کم و بیش دس گیارہ سال ہوتے یونیورسٹی پر تحقیقاتی کمیٹی بیٹھ چکی تھی۔ بعض دوسرے لوگوں کی طرح مولینا خاص طور پر زد میں تھے۔ ہر طرف سراسیمگی چھائی ہوئی تھی، نفسی نفسی کا عالم تھا بڑے بڑے سورماؤں کے پاؤں لڑکھڑانے لگے تھے۔ اس وقت کا حال کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جن پر وہ عالم گزر چکا ہے۔ اس زمانہ میں میں نے مولینا کو دیکھا کہ کیا مجال کہ روزمرہ کے معمولات میں فرق آ جاتا جن کے بارے میں جو رائے رکھتے تھے اس کا علی الاعلان اظہار کرتے۔ شام کے وقت برآمدہ میں لوگ بیٹھے ہوتے، چائے نوشی کی صحبت گرم ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے مصیبت کا کہیں نام نشان نہیں۔ کسی کی مجال تک نہ ہوتی کہ آنے والی آفت کا تذکرہ کرتا۔ ایک دن شب میں میں بھی حاضر ہوا۔ میں مرحوم کی خدمت میں اکثر ایسی باتیں بھی کہہ جاتا جو دوسرے کہنے میں ہمیشہ تامل کرتے تھے۔ میں نے کہا مولینا کیا ہونے والا ہے۔ خدانخواستہ نوع دیگر ہوا تو کیا ہوگا۔ کہنے لگے رشید! تم بھی ایسا کہتے ہو۔ مجھے خیال تھا تم اس قسم کا ذکر نہ چھیڑو گے۔ ہوگا کیا وہی ہوگا جو ازل سے تقدیر میں ہو چکا ہے۔ مومن کی شان یہی ہے کہ اس پر ہراس طاری نہ ہو۔ تم ڈرو گے تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو تم کو اپنا سردار سمجھتے ہیں جو ہونے والا ہے وہ ہو چکا ہے پھر ڈرنے جھجکنے سے کیا فائدہ۔

مولینا پر اس وقت ایک عجیب جلال سا طاری تھا اور مجھے شہنشاہیت روما کا وہ عہد یاد آ گیا جب گالس نے روم پر قبضہ کیا اور وحشیوں نے فتح کے نشہ میں آ کر سینٹ کا رخ کیا جہاں کا ہر رکن اپنی اپنی جگہ متانت اور وقار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جن میں سے ہر ایک کو وحشیوں

۱۷ نے نشست ہی پر ذبح کر دیا۔ لیکن کسی سینیٹر نے نہ اپنی جگہ چھوڑی اور نہ آہ و زاری کی۔

وہ دن گزر گئے جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہو چکا مرحوم بھی جوارِ رحمت میں پہنچ گئے، اس وقت میں اس زمانہ پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ کیسا مرد اور کتنا بڑا سردار ہم سے چھین لیا گیا۔ مرحوم میں سرداری کی بڑی بڑی باتیں تھیں۔ تحقیقاتی کمیٹی کا زمانہ کوئی معمولی نہ تھا۔ اس وقت صرف مولینا کی ذات ایسی تھی جو اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح قائم تھی۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ مرحوم زندہ ہوتے اور ان کے تاریخی دو منزلہ پر دشمن کے ہوائی جہاز بم برساتے ہوتے تو بھی مولینا کے معمولات میں کوئی فرق نہ آتا!

۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے، نان کواپریشن کا سیلاب اپنی پوری طاقت پر ہے "گائے کی قربانی" اور "سوالات" پر بڑے بڑے جید اور مستند لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے اُس زمانہ کے اخبارات، تقاریر، تصانیف اور رجحانات کا اب اندازہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ کہا جا رہا ہے وہی سب کچھ ہے۔ یہی باتیں ٹھیک ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور بات ٹھیک ہو نہیں سکتی تھی۔ کالج میں عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ مرحوم مطعون ہو رہے تھے۔ لیکن نہ چہرہ پر کوئی اثر تھا اور نہ معمولات میں کوئی فرق۔ اُس زمانہ میں میں اُسی دو منزلہ کے عقبی کمروں میں رہتا تھا اور میرے اور مرحوم کے نشست کے کمروں میں صرف ایک دیوار حدِ فاصل تھی جس میں ایک دروازہ بھی تھا۔ دن میں کئی کئی بار ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔

کہتے تھے رشید دیکھو، علماء کس طرح لیڈروں کا کھلونا بنے ہوئے ہیں اور لیڈروں نے مذہبی اصول اور فقہی مسائل کو کیسا کیسا گھر گھروندا بنا رکھا ہے۔ میری سمجھ میں اُس وقت ساری باتیں نہیں آتی تھیں، اور نہ میں ان تفصیلات میں پڑنا چاہتا تھا۔ لیکن مرحوم پر ایک خاص

کیفیت طاری رہتی تھی۔ وہ رہ رہ کر انہیں باتوں کو چھیڑتے تھے اور کہتے تھے کہ میں جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ کالج اس قسم کے مناقشوں کا مرکز بنے لیکن کیا کروں، خدا کو تو بعد میں منہ دکھانے کا موقع ملے گا اس دنیا کے لکھے پڑھے لوگ کیا کہیں گے۔

بالآخر مولینا نے ان مباحث پر قلم اٹھایا، اور دن رات قلم برداشتہ لکھتے رہتے۔ اکثر مجھے بٹھا کر سناتے اور رائے طلب کرتے۔ میں کہتا مولینا میری مذہبی معلومات اتنی نہیں ہیں کہ میں محاکمہ کر سکوں۔ آپ جو کہتے ہیں ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ کہتے یہ بات نہیں ہے تم پر اس ہڑ ٹھم کا اثر نہیں ہے۔ اور سمجھتے ہو کہ یہ سینکڑوں علماء جو کچھ کہتے ہیں وہ ٹھیک ہے اور میں کالج کا مولوی یوں ہی ہانکتا ہوں۔ یہ بات نہیں ہے۔ ہم تم زندہ ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کون حق پر تھا اور کون ناحق پر!

سیلاب گزر گیا، جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہوا۔ لیکن مرحوم نے اس عہد سراسیمگی میں جو کچھ لکھ دیا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت وہی تھی۔ اس کا ایک ایک حرف صحیح تھا۔ آج تک اس کی سچائی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ سارے علماء سیلاب کے زد میں آچکے تھے۔ صرف مرحوم اپنی جگہ پر قائم تھے۔ اس کا اعتراف کسی نے نہ کیا اور نہ کبھی مولینا نے کہا کہ ہم نے آپ نے مولینا کی اس خدمت اور قابلیت کا اعتراف کیوں نہیں کیا۔ ایک دفعہ میں نے دریافت کیا تو مرحوم نے ہنس کر فرمایا لیکن میں ان کلمات کو دہرانا نہیں چاہتا۔ اس سے بدمزگی اور پیچیدگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے!

شاید تیس سال سے زیادہ کا زمانہ گزرا، جونپور میں سیرت رسول کا جلسہ تھا۔ مرحوم کی تقریر ہو رہی تھی۔ جلسہ کیا ایک جم غفیر تھا، مرحوم اپنے مخصوص والہانہ جوش و وارفتگی کے ساتھ تقریر کر رہے تھے، خاموشی کا یہ عالم تھا جیسے سارا مجمع ایک ہی متنفس تھا۔

اتنے میں دور سے ایک بوڑھا، پستہ قد، منحنی شخص جھکا ہوا انبوہ کو چیرتا ہوا بڑھتا نظر آیا۔ جس شخص کے پاس سے گزرتا ہے وہ خوف و عقیدت سے ہٹ کر تعظیم دیتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے پلیٹ فارم پر پہنچ گیا۔ مرحوم کو سینہ سے لگا کر پیشانی کا بوسہ دیا۔ اور واپس چلا گیا۔ یہ مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب تھے، حضرت جونپوری مرحوم کے استاد اور جونپور میں اُس وقت علم و فضل کے چشم و چراغ تھے۔

مرحوم میں اپنے استاد ہی کا جبروت و طنطنہ تھا۔ ان کی شفقت میں بھی جبروت کار فرما تھا۔ میں نے مرحوم کو جھجھک کر یا گول گول باتیں کرتے کبھی نہ پایا۔ ایک بار میں مرحوم کی خدمت میں حاضر تھا۔ یونیورسٹی کے ایک بہت بڑے آدمی نے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ مولانا براہِ نوازش آج شب کا کھانا غریب خانہ پر تناول فرماتے۔ مولانا نے بغیر کسی تامل کے بے لاگ کہا۔ نہیں جناب میرا آپ کا کھانے کا کھانا نہیں ہے یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ صاحب بڑے خفیف ہوتے لیکن مرحوم پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ ہم سب سخت متحیر ہوتے۔ آخر میں مرحوم نے فرمایا، جی ہاں میرا ان کا کوئی کھانا نہیں ہے۔ اس قسم کے کتنے اور واقعات ہیں، کتنی سال کی بات ہے مرحوم اجمیر شریف جا رہے تھے۔ اتفاق وقت جس گاڑی سے مرحوم سفر کرنے والے تھے اسی سے ایک بڑے ذی وجاہت بزرگ کا ..... یونیورسٹی کی طرف سے خیر مقدم تھا۔ ان سے مولانا آزردہ تھے۔ انہوں نے شاید یہ سمجھا کہ مولانا بھی ان کی پذیرائی کے لئے تشریف لائے تھے۔ دل میں خوش ہو کر آگے بڑھے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مولانا نے بغیر کسی پس و پیش کے فرمایا "جی" اس سعادت کے لئے دوسرے آتے ہوتے ہیں میں ہاتھ نہیں ملاتا" یہ کہہ کر اپنے ڈبہ میں سوار ہو گئے۔ آج تک کسی بڑے آدمی کی آمد پر یونیورسٹی کے کسی جلسہ میں شریک نہ ہوتے۔ کسی

بڑے آدمی کے گھر نہ جاتے تاوقتیکہ اُس سے یارانہ نہ ہوتا۔ مجھے معلوم ہے مرحوم کی ایسوں ایسوں سے بھی گہری دوستی تھی جن کو دین و مذہب سے دُور کا بھی سروکار نہیں اور ایسوں سے بھی تھی جو اپنے وقت کے بڑے جید عالم دین سمجھے جاتے تھے، ہر شخص محبت و احترام کے جذبات لے کر آتا تھا اور مطمئن و مسرور واپس جاتا۔ جس سے طبیعت نہ ملتی تھی کبھی اس کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی کہ مرحوم کی صحبتوں میں بیٹھ سکے۔ مرحوم اس معاملہ میں بڑے کھرے تھے۔ کبھی دنیا سازی کی خاطر کسی کی تالیف قلوب نہ کی۔ لیکن جن سے خاص تعلقات تھے اُن پر جان چھڑکتے تھے۔ اس کی تکلیف سے مضطرب ہوتے اور اس کی خوشی سے باغ باغ ہو جاتے۔

مولینا کے خلاف اخباروں میں بڑے نامعقول مضامین نکلے اور اکثر ایسے ناروا اور رکیک حملے کئے گئے کہ انہیں یاد کر کے آج تک میرا دل کڑھتا ہے اور لکھنے والوں سے مجھے قلبی نفرت پیدا ہو گئی ہے لیکن مولینا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ آج تک میں نے ان کی زبان سے کوئی کلمہ ایسا نہیں سُنا جس سے اندازہ کیا جا سکتا کہ مولینا پر اس کا کوئی اثر ہے ایک دن معلوم نہیں کونسا موقع تھا، اس اخباری گندگی کا تذکرہ آیا تو مرحوم نے فرمایا اور اپنے مخصوص قلندرانہ انداز سے "چلو آگے بڑھو۔ نہیں دیکھتے کون کہہ رہا ہے۔ صاحبزادہ ہو یہی دیکھتے ہو کہ کس کے خلاف کہہ رہا ہے، لڑائی مجھے پسند ہے، لیکن بہادروں سے بلبوائیوں سے نہیں"!

مرحوم کی شخصیت کا ایک عجیب کمال تھا جس کو میں محسوس تو کرتا ہوں لیکن وضاحت نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے مثال دینے سے یہ بات کسی قدر واضح ہو جائے مرحوم کے دن رات کے اٹھنے بیٹھنے والوں میں فرداً فرداً کوئی خاص جاذبیت نہ تھی لیکن یہی لوگ جب مرحوم کے حلقہ میں بیٹھے ہوتے تو یہ مجموعہ نہایت دلکش معلوم ہوتا تھا، اور ہر شخص فرداً فرداً نہایت

دلپذیر اور یہ بات کچھ افراد ہی تک محدود نہ تھی بلکہ مرحوم کے کمروں کے اندر جو چیز جہاں رکھی ہوتی اس میں بھی ایک خاص کشش نظر آتی۔

کم و بیش بیس سال سے مرحوم کے کمروں کے اندر کی تقریباً تمام چیزیں میری نظروں میں ہیں جو چیز جہاں آج سے بیس سال پہلے دیکھی تھی وہ آج تک موجود تھی۔ کرسیوں کی وہی ترتیب کتابوں کی الماری اسی جگہ پر تخت کی وہی جگہ وہی پوشش، کھونٹیوں کا وہی مقام، پاندان اسی کرسی پر، چھوٹے چھوٹے بکس اور ٹوکریاں، تخت کے پائیں۔ آتشدان پر گھڑی، بوتل چائے کا ڈبہ، دو چار پیالیاں، کھلی ہوتی رشلف پر بادامی کاغذ پر چھپی ہوتی کتابوں کا انبار، تخت کے اوپر کھونٹیوں پر لٹکی ہوتی قیمتی کپڑوں کی شیروانیاں، اور خوش رنگ صافے ایسا معلوم ہوتا جیسے مرحوم کی شخصیت کے یہ سب عناصر ترکیبی ہیں۔ اب ادھر سے گزر ہوتا ہے تو دومنزلہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی اور دل بھر آتا ہے۔

میرا پہلا مکان دومنزلہ سے بہت قریب تھا، مردانے کے بیرونی دروازہ کے سامنے سڑک کی دوسری جانب درختوں کی جھلملی میں دومنزلہ کا قوسی برآمدہ اور چبوترہ نظر آتا تھا۔ گھر میں کوئی زیادہ بیمار ہوتا اور طبیعت پریشان رہتی تو نہ کہیں جانا اچھا معلوم ہوتا اور نہ گھر کے اندر رہنے کی ہمت پڑتی تھی، کبھی کبھی دروازہ سے باہر نکلتا تو مرحوم اپنے چبوترہ پر لمبی کشادہ آستینوں کا سپید کرتہ پہنے سر پر گول مخمل کی ٹوپی اور پاؤں میں دلی کی نازک سی زر جوتی پہنے سر نیچے کئے ہوئے دونوں ہاتھ کمر پر باندھے تیز تیز قدموں سے چہل قدمی کرتے نظر آتے۔ دیکھ کر دل کو ڈھارس ہو جاتی، سوچتا کہ مرحوم اس وقت کوئی نہایت ہی اچھا شعر گنگنا رہے ہوں گے، اگر چلا جاؤں تو وہ اس طرح سے خیر مقدم کریں گے کہ طبیعت بحال ہو جائے گی۔ بس اتنا ہی احساس میرے تسکین قلب کے لئے کافی ہوتا۔ میں مکان کے اندر آ

جانا اور دعا کرتا کہ خدا اطمینان دے تو مولینا کے ہاں جاؤں اور جی بھر کر اُن کی شفقت، مرحمت اور لطافت و ظرافت سے جی سیر کروں۔

مرحوم کو میرے بڑے لڑکے اقبال سے بڑا انس تھا۔ حالانکہ ان کا نام عمر کسی بچے سے سابقہ نہیں ہوا تھا۔ وہ صرف چند مہینوں کا تھا۔ کہ اسے بلا بھیجتے۔ گود میں بٹھاتے اس کا نام کدو رکھا تھا۔ پیشاب کر دیتا تو کہتے ابے کدو تو نماز نہ پڑھنے دے گا۔ اچھا کوئی ہرج نہیں کہ پیشاب بڑا ہو گا تو کہے گا مولینا ابا پر پیشاب کر چکا ہے۔ جب وہ پاؤں پاؤں چلنے لگا تو اپنی دونوں ہاتھ کی انگلی اس کے ہاتھ میں دے دیتے اور کہتے ناچ بے کدو ناچ۔ اس کے بعد اپنے مخصوص دلنشیں لیکن پُر وقار لحن میں کہتے تو مُم تو مُم رے باجے تو مڑی تو مُم تو مُم رے باجے تو مڑی، ہاں ناچ بے کدو ناچ۔

سال ڈیڑھ سال کا تھا کہ ایک دن شام کو اقبال کو لے کر بھیکم پور چلے گئے، بغیر ہم سب کو اطلاع کئے۔ دوسرے دن واپس آئے۔ بے حد خوش۔ معلوم ہوا کہ بچے نے بالکل تنگ نہیں کیا۔ لیکن مرحوم تمام رات اس کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ انہوں نے بالکل اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ وہ ایکا ایک بغیر کہے سُنے کیوں اقبال کو بھیکم پور لے گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد ایک بار دو دن کے لئے بغیر کہے سُنے اقبال کو ٹونڈلہ لے کر چلے گئے۔ ایک دن اسی زمانہ میں بچہ کو دیکھ کر کہنے لگے کدو تیرا باپ تجھے کپڑے نہیں پہناتا۔ اچھا دیکھ تیرے لئے میں کپڑا بناؤں گا۔ چند ہی دنوں بعد دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت ہی پُر تکلف اچکن پہناتے ہوئے حسب معمول اسے نچا رہے ہیں۔

حج کے لئے تشریف لے گئے تو وہاں سے اقبال کے لئے ایک نہایت خوبصورت چغہ اور عقال لائے۔ اقبال رات میں روتا تو صبح کے وقت مولینا کا آدمی ضرور آتا کہ رات کو کدو

کیوں رو دیا۔ اسے بھیج دو۔ اقبال بڑا ہوا تو اکثر کھانے پینے کی چیزیں خود لے کر جاتا، مرحوم بہت خوش ہوتے اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ دے کر واپس کرتے۔ کھانے پینے کی چیزیں، میوے پھل ہمیشہ بھیجتے رہتے اور کہلا بھیجتے کہ یہ کدو کے لئے ہے۔ وفات سے سال سوا سال پہلے صحت اچھی نہیں رہی تھی۔ اقبال کچھ لے جاتا تو کہتے ابے کدو اب میں بیمار ہوں اور بڈھا ہو گیا۔ اب تیری لائی چیز کیسے کھاؤں۔

اکثر کہا کرتے اقبال کو میرے ہاں بھیج دیا کرو میں اسے عربی فارسی پڑھاؤں گا۔ اب کدو بڑا ہو گیا۔ اب نہیں ناچے گا اس لئے اب اسے دوسرا ناچ نچاؤں گا۔ اقبال کچھ دنوں تک بہت بیمار رہا میں پریشان رہنے لگا مرحوم نے سنا تو فرمانے لگے ارے کدو کا جگر خراب ہے گھبراؤ نہیں کوئی بات نہیں، ڈاکٹروں کی بات میں نہ آؤ۔ یہ کتابی باتیں بناتے ہیں، مریض کو نہیں پہچانتے، پہاڑ لے جانا چاہتے ہو تو لے جاؤ، فائدہ ہوگا، لیکن کدو سے کہہ دو ناچتا رہے۔ تو مم تو مم رے باجے تو مڑی!

میرے مضامین کے پڑھنے شائق تھے، خود پڑھتے اور اپنے مخلصوں اور بے تکلف دوستوں کو سناتے، میں ملتا تو مضمون کے بارہ میں اپنی رائے بھی سنا دیتے اور یہ بھی بتا دیتے کہ کن کن کو انہوں نے مضمون سنایا اور کس کس نے کیا کہا۔ لیکن اکثر اس کے خلاف بھی ہوتا۔ ایک دن یونیورسٹی آفس سے اتر کر اسٹریچی ہال کی طرف آ رہے تھے۔ میں سڑک سے گزر رہا تھا، سلام کیا بولے، اجی یہ کیا تم مہمل لکھنے لگے ہو۔ اس دفعہ کا مضمون بڑا لغو تھا۔ ہاں بالکل بے سر و پا، اچھا جاؤ اپنا کام دیکھو، میں نے چاہا کہ کچھ کہوں کہنے لگے بس بس آج اتنا ہی وہ دیکھو تمہارا ابا آ رہا ہے۔ جاؤ!

مرحوم کی سیرت کا ایک خصوصی پہلو یہ تھا وہ جو چیز پسند رکھتے تھے اس میں کوئی نہ کوئی

خاص بات ضرور ہوتی۔ بڑی دلکش ہوتی، بڑی قیمتی ہوتی یا اس کے ساتھ کوئی خاص روایت
وابستہ ہوتی۔ ہمیشہ پاکیزہ قیمتی اور مردانہ وضع کے لباس پہنتے، گراں قیمت اور نادر قسم کے
اونی کپڑوں کا بڑا شوق تھا۔ شیروانی یا روئی دار اچکن کا کپڑا بڑا صوفیانہ اور دلکش ہوتا۔
ایک دفعہ افغانستان سے ایک گرم عبا منگائی تھی، فاختئی رنگ کا کپڑا جس پر ابھرے
ہوئے ریشمی پھول کاڑھے گئے تھے۔ ایک دن میں پہنچا تو بولے خوب آئے۔ چھمن وہ عبا
تو لانا۔ یہ بھی کیا کہیں گے کہ مولوی کے پاس کیسے کیسے مال غنیمت ہیں۔ عبا لائی گئی بڑے
شوق سے پہنا، بولے کیا رائے ہے۔ میں بہت قریب پہنچ کر دیکھنے لگا۔ بولے خیریت
تو ہے اس قدر انہماک کا اظہار کیوں کیا جا رہا ہے؟ میں نے عرض کیا کیا کہوں۔ اسی
طرح کی ایک چیز اس دن جلسہ میں نواب مزمل اللہ خاں کو پہنے دیکھا تھا، ان کے قریب
تو جانے کی ہمت نہ ہوئی آج آپ کے پاس ویسی ہی چیز دیکھی تو کہا موقع اچھا ہے اس
تخت طاؤس کو ذرا چھو چھا بھی لوں۔ بڑے زور سے ہنسے، کہنے لگے باز نہ آؤ گے،
اچھا ایک پان بناؤ اور یہ تو بتاؤ وہ تمہارا یار ذاکر کہاں ہے، بڑا آدمی ہے، ذرا صحت
اچھی نہیں ہے۔ میں نے کہا جی ہاں ان دنوں صحت اچھی نہیں ہے۔ ابے یہ کیا، میں
کہتا ہوں اس کا ساتھ نامعقولوں سے پڑا ہے تم کہتے ہو صحت اچھی نہیں پھر آواز دی
جمّا ذرا ایک طشتری میں رشید کے لئے پنڈی تو لانا۔

مرحوم کے معمولات بھی غیر معمولی تھے، سردیوں میں باہر سوتے تھے، ابتدا میں تو بالکل
صحن میں لیکن ادھر چند سالوں سے برآمدہ میں آرام کرنے لگے تھے۔ گرمیوں میں اندر
رضائی اوڑھ کر، بستر گداز، چادریں ستھری، تکیے متعدد۔ پنکھے کا کوئی دستور نہ تھا۔
گرمی میں نہ برف کا پانی مل سکتا تھا نہ سردی میں گرم پانی۔ ہمیشہ کہتے تھے کہ پسینہ آنا

بہت اچھا ہے۔ شام کا نہانا اور دھوپ میں بیٹھنا منع کرتے تھے۔ دوسرے کے زلیے یار و مال سے ہاتھ نہیں پونچھتے تھے۔ ننگے سر مشکل دیکھے جاتے تھے، گفتگو بلند آواز سے کرتے۔ کانا پھوسی گوارا نہ تھی، عمامہ اکثر ہلکے زعفرانی رنگ کا ہوتا اور جوتی دلّی کی پر زر ململ کا لمبا بڑی کشادہ آستینوں کا کرتہ پہنتے جس کے نیچے ہمیشہ ململ کی بٹن دار صدری ہوتی۔ کپڑا اُٹھتی اور شریفانہ رنگ اور وضع کا ہوتا۔ کسی کو اچھا کپڑے پہنے دیکھتے تو خوش ہوتے اور تعریف کرتے ناپسند ہوتا تو کہہ دیتے۔ سالن بڑی نرم مرچوں کا پسند تھا۔ ہمیشہ چٹائی پر اُکڑوں بیٹھ کر کھاتے، نوکروں کا بڑا پاس رکھتے۔ لکھنے میں سطر کبھی نہیں سیدھی ہوتی۔ جسے دوست رکھتے اُس سے نہایت خوش ہو کر آگے بڑھ کر جی کھول کر ملتے اور کوئی نہ کوئی خوش طبعی یا خوش دلی کا فقرہ ضرور کہتے۔ مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے۔ نہ کسی کے علم سے نہ کسی کی دولت سے نہ کسی کے اقتدار سے۔ مذہبی عقائد میں کٹر، سلوک میں بے لوث، جو جتنا چھوٹا ہوتا اس سے اتنی ہی فروتنی سے ملتے۔ بڑا ہوتا تو اُس سے کہیں اور بڑا ہو کر ملتے۔ علم کا وقار ان کے دم سے تھا معزز و محبوب مولوی میں نے ان ہی کو پایا!

قد میانہ، رنگ صاف، جلد روشن، اعضا نیلے، نقشہ نرم و نازک، آنکھیں ٹھوڑی جن میں جذبات کا اتار چڑھاؤ جھلکتا رہتا نظر تیز و پُر اعتماد، انداز میں بانکپن، انگلیاں ایسی جن میں قلم شمشیر و رباب سبھی زیب دیں۔ آواز میں کڑک اور لچک، دھمک بھی۔ خطابت پر آتے تو معلوم ہوتا صفیں اُلٹ دیں گے۔ نماز پڑھاتے تو معلوم ہوتا کہ خدا کا کلام دوسروں کو پہنچانے میں اپنی اور اپنے مالک دونوں کی عظمت کا احساس ہے۔

جمعہ کی ایک نماز یاد ہے، جاڑے کے دن تھے، یخ بھری ہوائیں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا رگ و ریشہ میں سوئیاں بن بن کر اترتی جاتی ہیں۔ ناظم صاحب دینیات غالباً موجود نہ تھے۔ مرحوم امامت کے لئے آگے بڑھے۔ تکبیر بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ مولینا نے کہا اللہ اکبر، ایسا معلوم ہوا جیسے اس صدا نے فضا کی ہر صدا کی لرزش چھین لی۔ اس کے بعد جو قرأت شروع کی ہے تو یہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے خالد کی تلوار میدان جہاد میں کوندتی لرزتی گرتی لپکتی کاٹتی، سمٹتی تیرتی ابھرتی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ کوئی لمبی سورۃ تھی۔ جب تک ختم نہیں ہوتی یہ معلوم ہوتا تھا جیسے جسم و جان میں بجلیاں بھر گئی ہیں۔ اور شوق خود سپاری میں ہم ہی نہیں در و دیوار بھی جھوم رہے ہیں۔ اس دن کی نماز اب بھی یاد ہے اور وہاں اس پر ایمان بھی ہے کہ وقت آ گیا تو شوق شہادت دنیا کے ہر شیب و فراز اور زندگی کے ہر تامل و تذبذب کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گا!!

مرحوم ایسوں سے کبھی علمی گفتگو نہ کرتے جن کے بارہ میں ان کو یقین ہوتا کہ اس کو علم کا گھمنڈ ہے یا علم کی گہرائی یا وزن نصیب نہیں ہے یا صرف دنیوی اقتدار کا حامل ہے۔ اگر کوئی چھیڑ بھی دیتا تو ٹال جاتے ورنہ صاف کہہ دیتے کہ کوئی دوسری بات کیجئے آپ کو ان باتوں سے کیا سروکار!

المبین شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ سر اقبال مرحوم کو بھی بھیجا تھا۔ اتفاق سے کچھ ہی دنوں بعد اقبال مرحوم اپنے لکچروں کے سلسلہ میں علی گڑھ تشریف لاتے۔ کھانے پر ایک جگہ مرحومین کی ملاقات ہو گئی۔ المبین کا ذکر چھڑ گیا۔ سر اقبال مرحوم نے بڑی تعریف کی اور فرمایا مولینا آپ نے عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کی طرف پہلے کبھی میرا ذہن نہیں منتقل ہوا تھا۔ گفتگو ہوتے ہوتے ایک ایسا موقع آیا جب سر اقبال مرحوم نے فرمایا کہ مولینا دوسرے اڈیشن میں اگر اس بحث کو بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیجئے تو بہتر ہوگا۔ ایک ذی وجاہت بزرگ جن کو یونیورسٹی کے نظم و نسق میں کافی عمل دخل تھا اور اپنے سن و سال اور قومی خدمات کے اعتبار سے

بھی علی گڑھ کی دنیا میں بہت کچھ اہمیت حاصل تھی - مرحومین سے ذرا فاصلہ پر دسترخوان پر موجود تھے - وہیں سے آواز دی ہاں مولینا میری بھی وہی اٹلتے ہیئے جو سر اقبال نے دی ہیئے، دوسرے ایڈیشن میں ...... ؟ اتنا ہی کہہ پاتے تھے کہ مرحوم نے للکارا " .... صاحب ایں کیجیے، آپ کھانا کھائیے، آپ کو ان باتوں سے کیا نسبت - ان باتوں میں نہ پڑیئے - کھانا کھائیے ——— ملاحظہ فرمایا نہ - ہاں - بس کھانا کھاتے جاتے !"

ایک اور بزرگ جن کے بارہ میں کچھ نہ کہنا ہی زیادہ مناسب ہیئے - دینیات کے نصاب سے دِل چسپی لینے لگے، کتابوں پر جہاں تہاں نشانات لگا کر مرحوم کے پاس بھیج دیا کرتے تھے - توقع یہ تھی کہ مرحوم تبادلہ خیالات سے ان کی عزت افزائی فرمائیں گے - مرحوم نے تحریری کوئی جواب نہیں دیا - ایک صاحب سے یہ البتہ کہلا دیا کہ کتابیں موصول ہوئیں - انہوں نے اسی کو غنیمت سمجھا - ایک دن حلقہ چائے نوشی میں آ کر شریک ہوئے اور نفیبالوحی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ مرحوم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا، آپ کو دینیات سے کیا واسطہ، آپ کے اپنے مشاغل کیا کم ہیں کہ دینیات کی طرف توجہ فرمائیں - وہ صاحب خفیف ہو کر خاموش ہو گئے - تھوڑی ہی دیر میں آموں کا تذکرہ آ گیا - اس میں نو وارد نے بڑی انہماک سے حصہ لینا شروع کیا - مرحوم نے فرمایا یہ ٹھیک ہیئے - اس پر گفتگو کیجیے - ملاحظہ فرماتے ہو نہ، یہ آپ کا حق ہیئے -

کچھ دنوں کی بات ہیئے کہ مرحوم کے ہاں ایک بڑے سن رسیدہ بڑے بزرگ اور بڑے جید عالم ٹھہرے ہوئے تھے - آپس میں بے تکلفی تھی ورنہ ظاہر ہیئے خانقاہ میں کسے نیند آسکتی تھی، پچھلے کی سردی تھی، مرحوم حسب معمول برآمدہ میں سو رہے تھے اور مہمان کمرہ کے اندر - مہمان تہجد کی نماز پڑھنے اُٹھے دروازہ کھولنے پر مرحوم کی آنکھ کھل گئی - پوچھا کون ؟ جواب ملا، کوئی نہیں میں ہوں - بولے خیر تو ہیئے کہا وضو کروں گا، بولے تو کیجیے کہ کسی کی نیند کیوں حرام

کرتے ہیں۔ انھوں نے دبی زبان سے کہا، تھوڑا گرم پانی مل جاتا۔ فرمایا "جہنم میں"۔ مہمان نے کہا
مکرر ارشاد ہو، پورے طور پر سن نہ پایا، بولے گرم پانی جہنم میں ملے گا۔ انھوں نے جواب دیا تو
اُٹھو راہ بتاؤ۔ مرحوم نے قہقہہ لگایا، بولے نیند تو غارت کی لیکن فقرہ خوب کہا۔

ایک دن کلاس پہنچے، خلافِ معمول بہت کم لڑکے نظر آئے پوچھا کیا بات ہے معلوم
ہوا باہر سے کوئی مشہور کرکٹ ٹیم آئی ہوئی ہے، بڑے معرکہ کا میچ ہو رہا ہے۔ ایک لڑکے
نے کہا مولینا چھٹی دے دیجیے تو ہم سب بھی دیکھ آئیں، بولے ہاں چھٹی ہے مقصود حاضری تھی۔
لڑکے نے جواب دیا مولینا حاضری لیجیے گا تو نمبروں کا نقصان ہو جائے گا۔ فرمایا حاضری اپنی
مقصود تھی، تمہاری نہیں، جاؤ تم بھی میچ دیکھ آؤ!

بہت دنوں کی بات ہے کہ میں کلاس میں لوائح جامی اور گلشن راز پڑھایا کرتا تھا۔
ان میں بعض مقامات میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ کبھی کبھی اپنی دقتیں لے کر مرحوم کے پاس پہنچ
جاتا۔ بڑے خوش ہوتے۔ کہتے بیٹھو، میں کہتا مولینا کلاس شروع ہونے والی ہے، صرف چند
مقامات ہیں جہاں اٹکتا ہوں۔ فرمایا یہی تو مصیبت ہے تفصیل سے باتیں نہیں سنتے تھوڑا سا پایا
لیا اور بھاگ نکلے، طالب علم یہ نہیں کرتے یہ کام اٹھائی گیروں کا ہے۔ پچھڑیاں ہوں ٹکریاں،
سب اٹھائی گیرے، علم کی عظمت باقی نہیں رہی تو طالب علم میں سعادت کہاں سے آتے۔
میں نے کہا مولینا گھنٹہ ہونے والا ہے سنا اٹھائی گیروں پر بھی تو بُرا وقت آتا ہے کہتے اچھا اچھا
اور لو پڑھو، میں پڑھنا شروع کرتا۔ بیچ ہی میں روک دیتے۔ کہتے معلوم ہے پھر اس کی وضاحت
کر دیتے اور چلنے لگتا تو کہتے دیکھو پھر کہتا ہوں قرآن پڑھ ڈالو۔ لوائح جامی اور گلشن راز کلاس
میں پڑھا دو گے لیکن قرآن پڑھے بغیر لکھے پڑھوں کے مجمع میں ان مباحث کو مت چھیڑنا۔ آگے
تم جانو تمہارا کام اور ہاں ایک پان کھاتے جاؤ۔ میں نے کہا جی نہیں کلاس بھاگ جائے گی۔

کہتے ٹھہرو ٹھہرو، پڑھانا آتا ہے تو کلاس بھاگ جاتے تو بھاگ جائے پڑھنے والے انتظار کرتے رہیں گے۔ پان تو کھاتے ہی جاؤ۔

ایک بار چائے نوشی کی صحبت گرم تھی۔ سارے درویش موجود تھے۔ ایک صاحب تھے جن کو خانقاہ سلیمانیہ میں لائف ممبری کا درجہ حاصل نہ تھا لیکن اکثر بار یا جاتے تھے۔ مولینا لطف اللہ صاحب مرحوم کے علم و فضل کا تذکرہ تھا کہ تذکرہ صدر بزرگ بھی آپہنچے۔ یہ مولینا لطف اللہ صاحب مرحوم کے شاگرد تھے۔ چنانچہ آنے کے ساتھ ہی گفتگو میں شریک اور تعریف و توصیف میں سب سے پیش پیش نظر آنے لگے۔ مرحوم نے چائے کا ایک دہکتا دہکتا نیم جرعہ لیتے ہوتے فرمایا بھائی میں تو مولینا لطف اللہ صاحب کی کرامت کا بھی قائل ہوں۔ نووارد نے تعجب میں آکر پوچھا مولینا یہ کیونکر، مرحوم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا "اور جنہوں نے آپ کو پڑھا دیا یہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے"!

کئی سال ہوتے ایک رات گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ زنانی سواریاں آئی ہوئی ہیں۔ میں نے کہا چلو مولینا کے ہاں ہو آؤں، پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں۔ کلاسکل چھوٹی گول میز کے سامنے اپنی کرسی پر پاؤں اٹھائے اکڑوں بیٹھے ہوئے کوئی چیز غور سے پڑھ رہے ہیں۔ میں نے کہا مخل تو نہیں ہوا۔ بولے بیٹھ جاؤ، ابھی بتاتا ہوں۔ میں بیٹھ گیا، عینک کے اوپر سے نگاہ کرکے بولے، ہنکانے سے بیٹھو، گپ ہوگی تھوڑی ہی دیر میں پرچہ علیحدہ رکھ دیا، عینک کو اس کے خانہ میں رکھا پھر بولے شنو۔

ادھر رہ گئی یا اُدھر رہ گئی
وفا کی شکایت مگر رہ گئی

"بے نظیر شاہ" کو جانتے ہو نہ، میں نے کہا جی، شاہ صاحب کو کون نہیں جانتا، کہنے

لیجئے اور سنو۔

انل میں ہر انجام لکھا گیا
شبِ غم کی لیکن سحر رہ گئی

بولے یہ شخص چھوٹی بحر میں کہنے کا بادشاہ ہے۔ میں نے کہا درست بادشاہوں کا کیا کہنا،
بے اختیار ہوکر فرمایا، وہ بھی ٹھیک کہتے ہو، ہاں ہاں ہم سمجھے۔ بادشاہوں کا کیا کہنا۔
میں نے کہا تو کیا اسی کا مطالعہ ہو رہا تھا، فرمایا نہیں یہ نہیں، ایک اشتہار تھا۔ میں
اشتہارات اکثر پڑھ لیا کرتا ہوں اس سے تمہاری قوم کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ دوا کا
اشتہار تھا۔ دُنیا میں اور امراض کی دواؤں کا بھی اشتہار دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں صرف
ایک ہی مرض ہے، جدھر دیکھو اسی کا چرچا، جس طرف دیکھو قوتِ مردمی کا ماتم، جہاں دیکھو
مایوس العلاج، اس سے اندازہ کرو کہ ہمارے کیا کرتوت ہیں، کیا خیالات ہیں اور ہم کدھر
جا رہے ہیں۔ اور پھر یہ بھی تو دیکھو تمہاری اُردو کہاں جا رہی ہے۔ شروع سے آخر تک یہی
اشتہارات۔ یہی امراض۔ میں نے کہا جی ہاں، فرمایا، اچھا اچھا، کھانا کھا لیا ہے، میں نے کہا
جی نہیں، کہنے لگے یہ بھی اچھا ہوا۔ میں کھالوں تو گپ ہو گی، تمہیں نہیں کھلاؤں گا۔ آج کل
صرف ایک پھلکا اور کدو گوشت کا سیٹھا پھیکا شوربا ہوتا ہے۔ بھوک لگی ہے؟ میں
نے کہا جی ہاں وہ تو قائم سی ہو گئی ہے، ہنسے آواز دی جما، نکتیوں کے لڈو لاؤ۔
لڈو آتے تو بولے کھاؤ، منیر کے ہیں منیر کے۔ منیر کا نام سُنا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔
غلط و کتابت بھی رہی ہے، بولے ہائیں یہ کیا؟ میں نے کہا وہی برادرم شمس الدین و
زین الدین ہنسے فرمایا خوب یاد رکھا اور ہاں ایک کدو کے لئے لیتے جانا۔ کدو اب بڑا ہو گیا۔
ہاکی کھیلنا ہے۔ خوب ناپتا تھا۔ کدو کہیں کا!

کھانے سے فارغ ہوتے حسب معمول صراحی سے براہِ راست حلق میں پانی انڈیل کر پیا۔ ہاتھ دھوئے اور اپنے سرخ لمبے چوڑے رومال سے ہاتھ منہ پونچھتے باہر نکل کر چبوترے پر مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر تک خلال کرتے رہے، میں نے پان بنا کر دیا اسے لے کر منہ میں رکھا مونڈھے سے ذرا ایک طرف مائل ہو کر پہلی پیک براہِ راست پیتل کے چمکدار اگالدان میں ڈالی۔ جو ٹھیک سوراخ میں جا گری اور اگالدان کے حاشیہ پر چھینٹ تک نہیں آئی۔ مرحوم اسی طرح اپنی اونچی کرسی پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے نیچے اگالدان میں پیک ڈالتے تھے۔ اور کہیں ادھر اُدھر اگالدان پر چھینٹ نہ پڑتی۔

قمری مہینہ کا شاید یہ تیسرا ہفتہ تھا، اکتوبر کا مہینہ، رات کسی قدر بھیگنے لگی تھی۔ چاند افق سے کچھ ہی بلند ہوا تھا۔ لیکن اس کا مدھم نمناک اُجالا، درختوں کی ٹہنیوں اور عمارات کے کنگروں پر نمایاں ہو چکا تھا۔ بولے کل رات میری طبیعت گھبرائی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ بالآخر دل میں آیا کہ مردوں سے گفتگو کروں۔ کہو کیا سمجھے، میں نے کہا بالکل نہیں سمجھا۔ کہا ہاں مُردوں سے۔ پھر اس کی وضاحت کی فرمایا۔ میں نے وہ پلندہ نکالا۔ جس میں ۲۵۔۳۰ برس کے خطوط رکھے ہیں۔ عزیزوں، دوستوں میں سے جو وفات پا چکے ہیں اُن کے خطوط۔ وہ خطوط جو انہوں نے زندگی میں لکھے تھے۔ ان سب کو نکالا بعض بالکل شکستہ تھے۔ بعض کی سوادِ تحریر بے نور ہو چکی تھی۔ بعض اس طرح لفافوں میں رکھے ملے۔ جیسے ان کو میں نے کھولا ہی نہیں تھا۔ مہریں تک پھیکی پڑ گئی ہیں۔ انہیں میں نے بڑی احتیاط سے کھولا۔ ڈر کر، محبت سے کبھی بے اختیار ہو کر کبھی مسرور ہو کر کبھی جھجک کر کھولا۔ ان سے باتیں کیں۔ وہ زمانہ یاد آ گیا جب زندگی عبارت تھی ان کے خلوص سے ان کے جھگڑوں سے ان کی فرمائشات سے۔ کسی میں کسی کے آنے کا مژدہ تھا۔ کسی نے بلایا تھا کسی نے مجھے

پریشانی میں تسکین دی تھی۔ پھر میں بالکل بھول گیا کہ یہ لوگ مر چکے ہیں۔ مجھے یقین ہوگیا کہ سب زندہ ہیں۔ (میں ہی مر چکا ہوں۔ ـــــ

پھر بولے، اور نہایت رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگے، تم جانتے ہو۔ بھائی صاحب مرحوم پورے پاگل تھے۔ میں نصف پاگل ہوں۔ کبھی کبھی پورا پاگل ہوجاتا ہوں۔ اس وقت ناواقف مجھ سے آزردہ ہوجاتے ہیں لیکن جو جانتے ہیں وہ جانتے ہیں۔

ہاں تو عجیب عجیب خطوط ملے۔ پاگل کا ذہن تم کو معلوم ہے کبھی کبھی ایسا سریع السیر، ایسا شفاف اور ایسا الجھن ہوجاتا ہے کہ بس ۔ ۔ ۔ ۔ ، ۔ ۔ ۔ اس کا احساس صرف پاگل ہی کو ہو سکتا ہے۔ تم کو ہوتا ہے؟ میں نے کہا جی نہیں لیکن ہو کر رہے گا خوش ہوگئے۔ کہا ایک پان اور بناؤ۔ میں ذرا پانی پی لوں۔ پان کھا کر اور پانی پی کر تھوڑا ٹہلے پھر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے یہ ذہن اور اس کے تصورات عجیب ہیں۔ پاگل کی ذہنی سطح ذی حواس کی ذہنی سطح سے بہت بلند ہوتی ہے۔ بہت واضح اور نہایت با معنی۔ وہ تمہاری عقل اور تمہارے اکتسابات شعوری و غیر شعوری سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کے تصورات زیادہ مخلصانہ ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت پا لیتا ہے۔ نتیجے نہیں استنباط کرتا اس کو نتیجہ استنباط کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

ہاں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کا خط دیکھ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا سامنے موجود ہے۔ میں نے اسے چھوا۔ میرا گھر بنوا رہا تھا۔ محبت سے محنت سے۔ یہاں دوڑ کر جاتا ہے، وہاں سے آواز دے رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے رک گئے۔ پھر بولے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کو جانتے ہو؟ میں نے کہا پورے طور پر یاد نہیں کہنے لگے وہ بھی موجود تھے۔ جوں کا توں لفافہ میں بند۔ پھر رک کے کہنے لگے سب موجود ہیں۔ خوب بات کرتے ہیں۔ ہنستے ہیں۔ اب قبرستان میں سوتے ہیں لیکن میرے ہاں ہنستے کھیلتے ہیں۔ سبھوں کو بند کر رکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اتنے میں ایک تانگا آیا۔ ایک صاحب نے اُتر کر کسی کا پتہ دریافت کیا۔ معلوم تھا جیسے مرحوم
کے اردگرد تصورات کی جو نیم شفاف اور نیم غیر شفاف بھول بھلیاں قائم ہو گئی تھیں وہ یک بیک
فضا میں تحلیل ہو گئیں۔ بولے بھائی آگے جاؤ یہاں کوئی نہیں۔ میں نے کہا رات زیادہ آ گئی۔ اب گھر
جاؤں گا۔ کہا جاؤ۔

عرصہ کی بات ہے ایک دن خود بخود فرمانے لگے ہم اس مغالطہ میں مبتلا تھے کہ ہم جیسا خبطی
شاید ہی کہیں ملے۔ لیکن ایک ہم سے بھی زیادہ بگڑے دل نکلے۔ صبح کمرہ میں سو رہا تھا حسب معمول
رضائی اوڑھ کر اور کمرہ بند کر کے۔ ایک صاحب نشست کے کمرہ میں آئے دیکھا کوئی نہیں ہے۔
سونے کے کمرہ میں آکر دستک دی اور سلام علیک کچھ اس انداز و لہجہ سے کہا کہ میں چونک پڑا۔ رضائی
کے اندر ہی سے جواب دیا وعلیکم السلام انہوں نے فرمایا۔ مزاج شریف، میں نے کہا، ابھی آنکھ لگی
تھی، فرمایا مولینا میں نے آپ کے ملاحظہ کے لئے ایک کتاب بھیجی تھی۔ جواب میں عرض کیا گیا۔
بھیجی ہو گی۔ آتی ہی رہتی ہیں، بولے آپ نے مطالعہ کیا، میں نے کہا یہ کیا ضرور ہے کہ مطالعہ کی جائے۔
یہ سب کچھ وہ کھڑے کھڑے فرما رہے تھے۔ اور میں رضائی کے اندر ہی سے جواب دے رہا
تھا۔ اتنے میں آواز آئی، مولینا آپ کی دو باتوں کی شہرت سُنی تھی ایک اخلاق کی اور دوسرے
علم کی۔ اخلاق کا حال تو معلوم ہو گیا علم کی بھی کسی دن تصدیق ہو جائے گی۔ سلام علیکم۔ ایں
گڑبڑا کر چارپائی سے اُٹھا اور جلدی جلدی نشست کے کمرہ میں آیا لیکن وہ جا چکے تھے۔

مرحوم دوست بنانے اور معالج انتخاب کرنے میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ ایک دفعہ کہنے
لگے سُنو جی علاج سے فائدہ نہیں ہوتا معالج سے فائدہ ہوتا ہے۔ جب تک معالج ٹکر کا نہ ہو
مریض کو کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ اس سلسلہ میں ایک قصہ سُنایا۔ کہنے لگے ایک دفعہ خیال آیا
کہ دلّی کے کسی اصلی حکیم سے رجوع کروں۔ چنانچہ بہت غور و فکر اور تلاش کے بعد ایک ایسے

طبیب کا انتخاب کیا گیا جو طب میں دہلی کے بعض مشہور اطبا کے استاد رہ چکے تھے ان کا نام بھی بتایا تھا لیکن یہاں مصلحتاً نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اسّی پچاس سال کا سن بڑے متدین، پرہیزگار اور صاحب کمال تھے۔ ان کے خیالات بھی عجیب وغریب تھے، یہ ناممکن نہ تھا کہ ان کے مطب میں کوئی شخص ترکی ٹوپی اوڑھ کر چلا جائے۔ ایک صاحب سوٹ پہن کر آ گئے تھے تو ایسے بھپرے کہ سارا مطب زیر وزبر ہونے لگا۔ اور جب تک وہ چلے نہیں گئے چین سے نہیں بیٹھے۔ کہتے تھے دیکھو تو جہاں میں نماز پڑھتا ہوں وہاں یہ مسخرہ ترکی ٹوپی اور کوٹ پتلون پہن کر چلا آیا۔ مرحوم نے ان سے ملاقات کی۔ بڑے تپاک سے ملے۔ مرحوم نے اپنی شکایات بیان کیں۔ بھوک نہیں لگتی۔ قبض رہتا ہے، تبخیر کی شکایت ہے، خیالات منتشر اور پراگندہ رہتے ہیں۔ اختلاج کی تکلیف ہو جاتی ہے، کبھی کبھی خفقانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، نیند بہت کم آتی ہے۔ وغیرہ۔

حکیم صاحب سب کچھ بہت غور سے سنتے رہے اور اکثر سر اس طور پر ہلا دیتے تھے گویا ہر بات دل نشیں ہوتی جا رہی ہے۔ جب مرحوم کہنا ختم کر چکے تو حکیم صاحب بولے ٹھیک ہے۔ بالکل بجا فرمایا، ایسا ہی ہوتا ہے، ایسا ہونا چاہیے۔ مرحوم نے فرمایا کوئی نسخہ تجویز فرما دیجیے۔ تو بولے، جی نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے، شرفا کا مرض ہے، شریفوں کو یہی شکایات لاحق ہوتی ہیں۔ مرحوم نے فرمایا آخر کوئی علاج، بولے بالکل نہیں، کوئی مرض ہو تو علاج کیا جائے اشراف انہیں شکایات میں مبتلا ہوتے ہیں۔

میری طالب علمی کا ابتدائی زمانہ تھا کالج کھلنے والا تھا، مرحوم وطن سے تشریف لا رہے تھے۔ میں الہ آباد میں ملا۔ مرحوم سکنڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے اور مرحوم کے بڑے بھائی جو عرصہ سے اپنا دماغی توازن کھو چکے تھے ہمراہ تھے۔ اسٹیشن پر مجھے دیکھا، بولے آ جاؤ، کھانا کھا لیا

جاتے گا۔ میں نے کہا میں سیکنڈ کلاس میں کیسے بیٹھوں، کھانا کھانے کے لئے ہر کلاس برابر ہے۔ کوئی پوچھے گا تو میں سمجھ لوں گا۔ تم تو آ ہی جاؤ۔ ایک انگریز بھی اسی ڈبہ میں تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر میں نے کہا اور یہ بیر فرسٹ ویم بیٹھا ہوا ہے۔ کہنے لگے گھبراؤ نہیں یار ہے آجاؤ۔ میں اندر آگیا انگریز نے مولینا کی طرف اس طرح دیکھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مولینا کی تجویز سے اتفاق کرتا ہے۔ مولینا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا ہاں بیٹھے رہو۔ سب ٹھیک ہے۔ سمجھ نا کھانا کھاتے گا۔ اس نے اشارہ سے ظاہر کیا گویا وہ ہر طرح راضی و خوشنود ہے۔ کھانے سے البتہ معذور ہے۔

نصف ڈبہ میں مولینا کا سامان رکھا ہوا تھا۔ ہر طرح کے بکس بستر، ٹوکریاں، ڈبے، گھڑیاں، صراحی، پاندان، کھانے کا سامان کیا گیا۔ ایک پوری برتھ کھانوں سے بھر گئی۔ ہر طرح کے کھانے، ہر ذائقہ کے حلوے، مٹھائیاں ان کے علاوہ، کہنے لگے یہ کھاؤ، ہماری طرف کی خاص چیز ہے۔ نیب کی کونپل اور کلیاں قیمہ کے ساتھ پکائی گئی تھیں۔ بڑی تیز مرچیں ڈالی گئی تھیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کی گئی تھی۔ دوسرا سالن خالص ہری مرچوں کا تھا پراٹھے، خستہ ٹکیاں اور پوریاں علیحدہ تھیں، بڑے مزے سے کھانا کھایا گیا، کہنے لگے خوب کھاؤ والدہ نے پکایا ہے یہ نعمت کہاں ملتی ہے۔ سمجھتے ہو، ماں نے پکایا ہے۔ ہاں۔ وہ یہ خیال کر کر کے کیسی خوش ہوتی ہوں گی۔ کہ سلیمان کھا رہا ہے، کھلا رہا ہے اور خوش ہو رہا ہے۔

مرحوم کے بڑے بھائی جو سفر حضر میں ہمیشہ ساتھ رہتے تھے کھانے میں شریک ہوتے۔ کیسی ہی پر تکلف دعوت یا معزز مہمان کیوں نہ ہوتے یہ ہمیشہ شریک رہتے تھے مرحوم ان کو "بھائی جان" کہتے تھے۔ بھائی جان بولتے بالکل نہ تھے۔ دستر خوان پر یک بیک آجاتے اور جو کچھ جی میں آتا اور جس طرح جی میں آتا کھاتے اور فوراً اٹھ کر چل دیتے۔ بھائی جان کی طرف

دیکھ کر کہتے کیوں بھائی جان ٹھیک ہے نا۔ وہ حسب معمول بالکل جواب نہ دیتے۔ ماں کا نام اور غالبًا مرحوم کی جوش اور محبت بھری باتیں سُن کر پہلو بدل لیتے۔ اور جلدی جلدی اچر سینز میں ہاتھ ڈالتے، کچھ ٹٹولتے اور تھوڑا ابنت اٹھا کر مُنہ میں رکھ لیتے۔

اسی زمانہ میں میری والدہ مرحومہ نے رحلت فرمائی تھی۔ مرحوم نے ماں کی باتیں کچھ ایسی وارفتگی سے بیان کرنا شروع کی تھیں۔ کہ میری طبیعت بھر آئی۔ مرحوم نے دیکھا اور بغیر کسی ارادہ یا تکلف یا قطع کلام کئے ہوتے، یا کھانے کی طرف سے توجہ ہٹاتے ہوتے کہا، ہاں ہاں وہ تو مجھے معلوم ہے لیکن ہو نہ چکا، خیال فرماتے ہو بس ہو چکا، بڑی خوش نصیب تھیں کہ تمہارے سامنے مریں تم ان کے سامنے نہ مرے ان کو یاد رکھو، ہمیشہ یاد رکھو، ماں کو کون بھولتا ہے، جب تک نہ بھولو گے لڑکپن کی خوش دلی اور حوصلہ باقی رہے گا۔ یہ لو پانی پیو۔ سب کچھ ماں کا دیا ہوتا ہے۔ اور ہاں یہ لینا۔ یہ آم . . . . . . کے باپ نے دیا تھا۔ کہتا ہے اس کے باغ کے درخت کا پہلا پھل ہے۔ جب تک میں نہ چکھ لوں گا کسی اور کو نہ ملے گا۔ اس میں تمہارا بھی حق پہنچتا ہے۔ یہ ہمارے بہار کا آم ہے۔

اتنے میں فتح پور آ گیا، کہنے لگے جاؤ، اٹاوہ پر پھر ملنا چائے پی جائے گی۔ مرحوم ہمیشہ سیکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے۔ بڑے سامان و اہتمام کے ساتھ، سیٹ ہمیشہ ریزرو کرا لیتے تھے۔ مرحوم اس زمانہ سے سیکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے جب سیکنڈ کلاس میں سفر کرنا خاص منزلت کی بات سمجھی جاتی تھی۔ اس سامان و اہتمام کے ساتھ آج کل میں اچھے اچھوں کو بھی فرسٹ کلاس یا سلون میں سفر کرتے نہیں پاتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی صاحب وقار سفر کر رہے ہیں۔ آسائش کی ہر چیز بڑھیا اور ستھری، ہمسفروں کا لحاظ رکھاؤ۔ لباس و اطوار میں صفائی اور خوش سلیقگی، جس غرض سے سفر کرتے تھے صرف اسی کو پورا کر کے واپس آ جاتے تھے۔ ایسا شاید کبھی ہوا۔

ہو کہ جس خاص غرض سے سفر کیا ہو اس کے علاوہ بھی کچھ اور کر کے واپس آئے ہوں۔
مشکل سے سال بھر ہوتے ہوں گے۔ رات کا وقت تھا، باہر چبوترہ پر بیٹھے ہوتے تھے۔
کہنے لگے آج تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ یہ تو بتاؤ دل میں کبھی کوئی خطرہ بھی گزرتا ہے میں
نے کہا میں آپ کے سوال کی نوعیت نہ سمجھا۔ خطرہ سے کیا مراد ہے۔ کہنے لگے مطلب یہ ہے
کہ ہر انسان کے دل میں کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ ہم سے یہ اچھا کام نہ ہو سکا۔ حالانکہ ہم ایسا
کر سکتے تھے۔ میں نے عرض کیا آپ تو جانتے ہیں میں اپنی زندگی سے بہت خوش اور مطمئن رہا
ہوں۔ مجھے ہمیشہ ہر وہ نعمت حاصل رہی جس کی میں نے خواہش کی لیکن ایک بات البتہ ایسی ہے
جو اکثر مجھے کھٹکتی ہے، کہنے لگے، ہاں ہاں وہی بات پوچھتا ہوں۔

میں نے کہا آج علی گڑھ آئے ہوتے ۲۳-۲۴ سال ہوتے، گھر سے پہلے پہل نکلا تو زندگی
کچھ اور تھی۔ اب کچھ اور ہے پہلا زمانہ بڑی تنگ حالی کا تھا۔ اب خدا کے فضل سے ہر طرح کی
کامرانی اور فراوانی حاصل ہے۔ یہ بھی اللہ کا کچھ کم احسان نہیں ہے کہ ماں باپ بھائی بہن جو
آج سے ۲۳-۲۴ سال پہلے موجود تھے سوا والدہ مرحومہ کے بقیہ سب بقید حیات ہیں۔ اور میری
کامرانی سے خوش اور مطمئن۔ لیکن جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ کہ علی گڑھ کی زندگی۔ یہاں کی ہماہمی۔
بیوی بچے دوست احباب۔ وطن سے دوری اور اس قسم کی بہت سی باتوں نے کبھی اس کا
موقع ہی نہ دیا کہ ان لوگوں کا دھیان بھی آتا جو میری دولت، راحت اور عزت میں شریک
ہونے کا حق رکھتے تھے، مجھ پر بہتوں کے حقوق ہیں ان حقوق کو میں تھوڑا بہت ادا کرنے کی
کوشش بھی کرتا ہوں لیکن دل گواہی دیتا ہے کہ جو کرنا چاہیئے اس سے اغماض کرتا ہوں۔
بہنیں اپنے گھر جا چکی ہیں، بھائی بھی برسر کار ہیں۔ ان میں کوئی آرام سے بسر کر رہا ہے
اور کوئی تنگی ترشی سے۔ والد صاحب گھر پر ہیں۔ کبھی کبھی وطن جاتا ہوں تو سب کو دیکھ بھال

آتا ہوں۔ والد صاحب آرام سے ہیں اور باوجود اس پیرانہ سالی کے وہ اب بھی دوسروں سے خدمت لینے کی بجائے دوسروں ہی کو آرام پہنچاتے ہیں۔ میں جانتا ہوں تو پھولے نہیں سماتے اور اب بھی میرا جی خوش کرنے کے لئے اور اپنا بھی، وہی باتیں کرتے ہیں جو بچپن میں میرے لئے روا رکھتے تھے۔ میں تھوڑے ہی عرصہ کے لئے ان سے ملنے جاتا ہوں اور جلد ہی واپس آ جاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے اگر میں اُن سے ملنے کے لئے ذرا دیر اور ٹھہر جاؤں تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ ہو گی لیکن وہ یہ جانتے ہیں کہ میں بیوی بچوں میں جلد سے جلد واپس آ جانا زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ اس لئے اشارۃً کنایۃً بھی کبھی اس کا اظہار نہیں کرتے کہ میں تھوڑے عرصہ کے لئے اور ٹھہر جاؤں۔

میں تھوڑی دیر کے لئے رُک گیا اور بولا، مولینا آپ کے سوال نے دل کے مدفون کے اٹھے ہوئے سوتے کھول دئے، ایسا تو نہیں کہ آپ اُکتا نے لگے ہوں۔ علی گڑھ میں اس قسم کے خیالات شاذ و نادر ہی آتے ہیں۔ آپ نے نہیں معلوم دل کے کون سے تار کو جنبش دے دی۔ کہ اس وقت طبیعت بے قابو ہو گئی۔ اس گفتگو کو ہیں کیوں نہ ختم کر دوں۔ مرحوم پر اس وقت ایک استغراقی کیفیت طاری تھی۔ چونک پڑے۔ کہا نہیں نہیں۔ کہے چلو۔ اب ختم کئے بغیر نہ رکنا۔

میں نے کہنا شروع کیا۔ سارا قصہ میں اس اندیشہ سے نہیں دہرانا چاہتا۔ کہ خود ناظرین کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک وہ باتیں معلوم نہ ہوں مرحوم کے اُس عمل ذہنی کا اندازہ نہیں ہو سکتا جو میں یہاں بتانا چاہتا تھا۔ میری داستان کا خلاصہ یہ تھا کہ میری علی گڑھ کی زندگی اُس زندگی سے بالکل مختلف ہو گئی تھی جو میں اپنے والدین اور اعزا کے ساتھ وطن میں بسر کر چکا تھا۔ اس زندگی میں یہاں میں گزشتہ آلام و مصائب کو بھول چکا تھا۔ وہاں اُن ذمہ داریوں کو بھی بڑے حد تک نظر انداز کر گیا جو اپنے بزرگوں اور عزیزوں کی طرف سے

مجھ پر عاید ہوتی تھیں۔ وہ مجھ پر اب بھی جان چھڑکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے رنج و راحت سے جتنا وہ ملول یا مسرور ہوتے میں اتنا ان کے رنج و راحت سے ملول اور محزون نہیں ہوتا۔ فراغت کی زندگی کی یہ محرومی اکثر میرے لئے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔

میں بزرگوں اور عزیزوں کے رنج و راحت میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے مسرت کے پیالہ کو جو بہت ہی اتھلا ہے اپنی توجہ سے لبریز کر دوں لیکن مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ نفس حیلے تراشتا ہے تو میں اپنی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہوں۔

مرحوم گردن جھکائے ساری داستان سنا کئے۔ میں خاموش ہو گیا تو یک لخت چونک سے پڑے، فرمایا، بڑی بات کہہ ڈالی۔ اللہ بخشنے والا ہے، خوب کہی، ٹھیک کہی، میرے دل کی بات کہہ دی، اللہ خوش رکھے، پھر اٹھ کر ٹہلنے لگے، کمر پر ہاتھ باندھ کر سر نیچا کئے دیر تک ٹہلا کئے، تھوڑی تھوڑی دیر بعد کہہ دیتے ٹھیک کہی، بڑے پتے کی بات کہی، بڑی مبارک بات ہے۔ نئی بات کہی۔ مرحوم کی اس وقت عجیب حالت تھی، کبھی یہ معلوم ہوتا جیسے عالم جذب طاری ہے۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے بہت مسرور و مطمئن ہیں۔ دیر تک یہ حالت قائم رہی۔ آخر میں کہا اس وقت جاؤ پھر کبھی اس پر مفصل بحث ہو گی۔

مرحوم کالج کے ضابطوں کے بڑے پابند تھے۔ رات کے وقت پکّی کچّی بارکوں کے دروازے بند ہو جاتے تھے۔ اور آمد و رفت کے لئے صرف وکٹوریا گیٹ میں ایک چھوٹا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ جس پر دربان مقرر تھا۔ اور آنے جانے والوں کے نام و پتے لکھ لیتا۔ آدم جی پیر جی منزل (ودو منزلہ) کے دروازے جس میں مرحوم تمام عمر مقیم رہے مارین روڈ پر کھلتے تھے۔ مرحوم بڑی رات گئے تک بیدار رہتے لیکن یہ ناممکن تھا کہ کوئی طالب علم یا شخص آدم جی پیر بھائی منزل کے دروازے سے سید محمود کورٹ میں آ جا سکے۔ مسجد سے عشاء کی نماز پڑھ

کر واپس آتے۔ اور کچھ لوگ ساتھ ہوتے تو مرحوم ان کو کبھی اپنی طرف سے باہر نکلنے نہ دیتے۔ ہمیشہ یہ کہہ کر واپس کر دیتے کہ وکٹوریا گیٹ سے باہر جاؤ۔ اس میں طلباء یا غیر طلبا کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ اس پر طلباء یا دوسرے لوگوں سے کبھی کبھی بدمزگی بھی ہوتی لیکن مرحوم نے اپنے اصول سے کبھی انحراف نہیں کیا۔

کم و بیش تیس سال تک دو منزلہ میں مقیم رہے۔ اگر مرحوم علی گڑھ میں موجود ہوتے تو دو منزلہ میں مرحوم کا موجود ہونا بھی یقینی تھا۔ برخلاف دوسرے لوگوں کے یہ ناممکن تھا کہ مرحوم محض تفریحاً یا اخلاقاً کہیں اور ملنے ملانے چلے گئے ہوں۔ ہمیشہ اپنے مستقر پر ملے سوا اس کے کہ کہیں شادی یا غمی کی تقریب ہو یا یونیورسٹی کے کام سے وائس چانسلر یا پرو وائس چانسلر نے طلب کیا ہو یا اپنوں میں سے کوئی بہت بیمار ہو۔ بہت کم لوگوں کو شاید معلوم ہو کہ مرحوم نے سوئمنگ باتھ نہیں دیکھا تھا۔ کہتے تھے ادھر جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ یہ بات میں نے بہت کم لوگوں میں پائی۔

یونیورسٹی میں بڑے بڑے لوگوں کی آمد پر جشن جلسے ہوا کرتے تھے۔ مرحوم ان میں کبھی نہیں شریک ہوتے۔ اس پر اکثر پیچیدگیاں بھی پڑیں لیکن مرحوم اپنی جگہ سے ذرا ادھر ادھر نہ ہوتے۔ کہتے تھے یونیورسٹی میں دولت و امارت کا کیا بیچ۔ ایسے لوگوں کے لئے ساری دنیا پڑی ہے وہیں یہ ڈھونگ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں علم و فضل دیکھا جاتا ہے۔ کوئی صاحب فضل و کمال آتے تو البتہ!

ایک بار کوئی میٹنگ تھی جس میں گفتگو تیز ہونی شروع ہوئی۔ ایسے موقع پر مرحوم کب قابو میں رہنے والے تھے۔ بعض لوگوں نے جو قریب ہی بیٹھے تھے مولینا کو دبایا کہ خاموش ہو جانا ہی مصلحت ہے۔ مرحوم نے جھپک کر کہا۔ خاموش کیسے ہو جاؤں ولسراتے کو اپدرس

نہیں دیا جا رہا ہے۔ علم و ایمان کے مسائل ہیں۔ خیال فرماتے ہو نہ۔ علم و ایمان کی آزمائش ہے۔ نیاز مندی یا اطاعت شعاری کی نمائش نہیں ہے۔ میٹنگ سے واپس آنے کے بعد مجھ سے فرمایا اور کیوں جی یہ تم بھیگی بلی بنے کیسے بیٹھے رہے۔ میں نے کہا مولینا بس تھوڑی ہی سی کسر باقی تھی۔ ورنہ آپ دیکھتے کہ بھیگی بلی گربہ عاجز بن جاتی۔ بڑے زور سے ہنسے پھر فرمایا "لیکن رہتے بلی ہی"۔

مرحوم مذہبی معتقدات میں بڑا غلو رکھتے تھے۔ اور اظہار کا موقع آتا تو کھلم کھلا ان کا اعلان بھی کر دیا کرتے تھے۔ بایں ہمہ مختلف الخیال لوگوں سے بھی بقول ان کے کھانا کھلا ہوا تھا۔ خانقاہ سلیمانیہ کے مقربین میں محمد اکرام اللہ خاں ندوی، مولانا ابوبکر صاحب، محمد مقتدی خاں شروانی، نواب صدر یار جنگ بہادر، سید زین الدین صاحب تھے۔ باہر والوں میں سے مولوی ابوالحسن صاحب، سید بہاء الدین صاحب کو یہ امتیاز حاصل تھا۔ مولینا ابوبکر صاحب کے بڑے مداح تھے۔ ایک دن کہنے لگے جب یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہو رہا تھا تو میں کچھ تذبذب میں تھا۔ تم تو جانتے ہو ان کا مسلک میرے مسلک سے جدا ہے، میں سمجھتا تھا شاید میرا ان کا نباہ نہ ہو سکے لیکن یہ آدمی تو بے نظیر نکلا۔ مولینا ابوبکر صاحب کو مثانہ کی تکلیف ہوئی۔ اور علالت کسی قدر تشویشناک صورت اختیار کرنے لگی تو ایک دن بڑی بیقراری سے فرمایا۔ اللہ شفا دے یونیورسٹی کیا دور دور ایسا آدمی نہ ملے گا۔ علوم پر بڑی اچھی نظر ہے۔ بڑی گہری نظر ہے، حاضر علم ہے۔ بڑی متوازن شخصیت ہے۔ نہ رعب کھاتا ہے نہ رعب ڈالتا ہے۔ یہ بات مولویوں میں ناپید ہے۔ پھر یاروں کا یار ہے۔ کہتے کہتے ایسا معلوم ہوا جیسے طبیعت میں گدگدی پیدا ہو گئی۔ کہنے لگے عجیب آدمی ہیں۔ کوئی کام ہو کسی کا کام ہو۔ کسی سے ہو عبا پہنی رومال کندھے پر ڈالا اور ڈنڈا سنبھال کر گھر سے

نکل پڑے۔ یہ شخص فرض کو فرض سمجھ کر نہیں پورا کرتا بلکہ اس کے ادا کرنے میں لطف اٹھاتا ہے۔ آج کل دیکھو کس کرب میں مبتلا ہیں لیکن معمولات میں کوئی فرق آیا ہے اور نہ بات چیت کرنے میں کوئی تردد یا اضمحلال کتنوں کی ان کے دم سے پرورش ہے۔ ہاتھ کھلا، دل غنی۔ بڑا پُر اسرار آدمی ہے!

ذاکر صاحب سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے کہا چلیے مولینا سے مل آئیں۔ ہم جیسے پہنچے مرحوم استنجا کرنے جا رہے تھے۔ میں پہلے کمرہ میں داخل ہوا کہنے لگے۔ "آخوہ یہ سواری باد بہاری کہاں سے آئی"۔ اچھا بیٹھ جاؤ استنجا کر آؤں۔ فوراً ہی ذاکر صاحب کمرہ میں داخل ہوتے۔ دیکھتے ہی مسرت سے چہرہ جگمگا اٹھا۔ ایک خاص انداز ترنم سے بولے، اہو ہو ہو، ڈاکٹر تم کہاں"؟ اہلاً و سہلاً۔ ذاکر صاحب نے فرمایا عرصہ سے حاضر نہیں ہوا تھا۔ آج ارادہ کر لیا کہ ضرور جاؤں گا، بولے جزاک اللہ جزاک اللہ۔ میری طرف مخاطب ہو کر بولے۔ خدا خوش رکھے انہیں خوب لائے، خوب لائے۔ لوٹا زمین پر رکھ دیا۔ میں نے کہا استنجے سے فارغ ہو آئیے۔ کہنے لگے نہیں اب نہیں۔ ڈاکٹر سے بات ہوگی۔ اب سب کام ملتوی۔ یہ کہہ کر تخت پر جا کر دو زانو بیٹھ گئے۔ تخت پر مولینا کم بیٹھتے تھے کوئی ہوتا یا آتا مرحوم معمولاً اپنی آفس کرسی پر گول میز کے سامنے دونوں پاؤں اٹھائے بیٹھے بیٹھے یا لیٹتے۔ تخت پر دو زانو بیٹھنا خاص ہی خاص مواقع پر ہوتا۔ جب طبیعت نہایت شگفتہ ہوتی تو تخت پر آجاتے اور دو زانو بیٹھتے۔ یہ انہیں کا فقرہ ہے کہ اب اجلاس تخت پر ہوگا۔ اس کے یہ معنی تھے کہ لطف صحبت میں کسی قسم کا خلل آنے نہ دیا جائے گا اور صحبت پورے طور پر گرم ہوگی۔ چاء تیار کی گئی۔ شفاف سبزی مائل چائے عنبر کی خوشبو سے معطر، تھوڑی شکر ملی ہوئی بغیر دودھ کے خوش نما بلوریں فنجان میں اس درمیان میں کوئی دوسرے درجہ کا آدمی آجاتا تو اسے فوراً رخصت کر دیتے اور فوراً کہہ دیتے اس وقت

جاؤ پھر کبھی آنا۔

اُس دن بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی، بڑے لطف کی باتیں بڑے محبت کی باتیں اور بڑے پتے کی باتیں۔

میں نے بہت کم لوگوں کو مرحوم جیسی پُر لطف باتیں کرتے سُنا ہے۔ برمحل لطائف یا فقروں کی کمی نہ تھی۔ لطیفے خواہ وہ کیسے ہی ہوں بے ضبطہ زبان کہتے تھے۔ ان کی زبان پر بعض غیر ثقہ فقرے بھی بڑے مزہ کے معلوم ہوتے تھے۔ میرا ان کا بڑے عرصہ تک ساتھ رہا ہے۔ میں نے ان کو شاید ہی کبھی ایک ہی لطیفہ یا فقرہ دہراتے سُنا۔ میں ایسوں سے بھی واقف ہوں جو بڑے لسان اور طرار سمجھے جاتے ہیں لیکن دو چار صحبتوں کے بعد اکثر یہی معلوم ہوا کہ فقرے اور لطیفے رٹے ہوئے ہیں جو موقع بے موقع دُہراتے جاتے ہیں، برمحل اور اچھوتا فقرہ چُست کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ مرحوم کو اس میں خاص درک تھا۔

میں نے انہیں جلال کے عالم میں بھی پایا ہے۔ علم و مذہب پر گفتگو کرتے کرتے اکثر جلال میں آجاتے۔ لیکن اس جلالت کی شان ہی کچھ اور ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ علم یا مذہب کے بل پر یا اُن کے ناموس کی حفاظت میں آمادہ پیکار ہیں۔ تحقیر یا تمسخر کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ لیکن جب بے تکلف دوستوں کے حلقہ میں ہوتے تو ان کی باتوں میں شگفتگی، رنگینی و زیبائی ہوتی۔ مرحوم یاد آتے ہیں تو سیّد زادہ میں

"عجم کا حسن طبیعت، عرب کا سوز دروں"

کا نقشہ بھی پھر جاتا ہے۔

مرحوم کے بڑے بھائی کا انتقال مرحوم کی رحلت سے کوئی دو سال پہلے علی گڑھ میں ہوا۔ بڑے بھائی جنہیں مرحوم "بھائی میاں" یا بھیّا کہتے تھے، مدتوں سے جنون میں تھے، بولنا

بالکل ترک کر دیا تھا۔ چپ چاپ ادھر اُدھر پھرا کرتے تھے۔ کسی سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتے تھے اور نہ کسی کے لئے تکلیف دہ تھے۔ مولانا مرحوم، بڑے بھائی سے اس حال میں جتنی محبت کرتے تھے اور اُن کے راحت کی جزئیات پر جیسی ان کی نظر تھی اس کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔ سیکنڈ کلاس میں انہیں ساتھ رکھتے تھے۔ دستر خوان پر معزز سے معزز مہمان کیوں نہ ہوتا بڑے بھائی ضرور بلائے جاتے۔ بڑے بھائی جس طرح جس کھانے کو کھانا چاہتے کھاتے۔ ان کے لئے سردی گرمی کا لباس بڑی محبت اور تکلف سے منگواتے۔ "بھائی جان" ہی کے لئے آدم جی پیر بھائی منزل کی شمالی سمت ایک احاطہ بنوا دیا تھا۔ جس میں ہر طرح کے پھول کے درخت لگوا دیئے تھے۔ برآمدہ میں پھولوں کے گملے تھے۔

بھائی بیمار ہوئے تو مرحوم سے پریشانی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ مریض اپنا حال نہیں بتا سکتا تھا۔ معدہ کی تکلیف تھی حکیم صاحب[1] معالج تھے۔ ان کی مشکل یہ تھی کہ معدہ کو آلائشوں سے پاک کرنے کا جو طریقہ مناسب ہو سکتا تھا۔ مثلاً عمل دینا اسے مولانا مرحوم برتنے نہیں دیتے تھے۔ کہتے تھے جھبلانے جو بات تمام عمر گوارا نہ کی اسے آخر وقت میں کیسے ہونے دوں۔ معلوم نہیں وہ کس عالم میں ہوں۔ ان کے دل پہ کیا گزرے گی۔ بول براز کا امتحان یا ان کے اخراج کا طریقہ یا ان کے متعلقات پر گفتگو کرنا خود مولانا مرحوم بالکل نہیں پسند کرتے تھے۔

بھائی کی بیماری میں مرحوم کا یہ عالم تھا۔ کہ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، سونے بیٹھنے کی کوئی فکر نہ تھی۔ لباس میلا کچیلا رہتا، اوقات مقررہ میں گڑبڑ، گفتگو میں ناہمواری کہنے لگے تھے۔ ایسے میں اپنے سطانیت چھوڑ دیتے ہیں۔ حکیم صاحب نے نہایت محبت، ہوشیاری اور جانفشانی سے علاج کیا۔ نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات، دوائیں اشیاء جو شربت اور دیگر ضروری چیزیں گھر سے تیار کرا کے بھیجتے۔ ضروری مشاغل سے فرصت پا کر مریض

---

[1] حکیم عبد اللطیف صاحب لکھنوی وائس پرنسپل طبیہ کالج علی گڑھ

کے پاس آبا نے ہر طرح کے جتن کئے گئے لیکن ایک پیش نہ گئی اور بھائی جان مولانا مرحوم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔

کچھ عرصہ بعد ایک دن مرحوم خود بخود فرمانے لگے رشید! معلوم ہوتا ہے کہ میری عمر بھی علی گڑھ ہی کی ہے۔ پہلے اکثر خیال آیا کہ اچھے بُرے دن سبھی دیکھ لئے اب یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو جاؤں۔ اور وطن جا کر بزرگوں کی یاد میں بقیہ زندگی بسر کر دوں۔ علی گڑھ میں زمین بھی مل سکتی تھی، کبھی یہ خیال آتا تھا کہیں مکان بنوالوں اور رہ بسوں۔ بھیا زندہ تھے۔ تو یہ سب خیال آتے تھے وہ چل دیئے۔ بہت سی ذمہ داریاں ختم ہو لیں تو بعض کمزوریاں بڑھ گئیں۔ اب ٹھان لی ہے کہ بھیا ہی کے قدموں میں جا بسوں۔ خدا سیّد زین الدین کا بھلا کرے۔ انہوں نے اپنے قبرستان میں تھوڑی سی جگہ دے دی ہے۔ اب کہیں نہ جاؤں گا۔ ہاں ذمہ داری ختم ہو جاتے تو کمزوری سے مغلوب ہو جاتا کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔

مرحوم کی زندگی کچھ عرصہ سے خراب چلی آتی تھی۔ بڑے بھائی کی وفات کے بعد اس میں بیتن اضمحلال پیدا ہو گیا تھا۔ پچھلے رمضان میں بخار آیا، معالج کے اصرار کے باوجود روزے رکھنے سے باز نہ آئے لیکن جب طبیعت زیادہ نڈھال ہونے لگی تو روزے ترک کر دیئے۔ مرض نے طوالت پکڑی لیکن کچھ عرصہ بعد افاقہ کی صورت پیدا ہوئی۔ میں بہت دنوں سے حاضر نہیں ہوا تھا۔ ایک دن کالج سے واپسی پر وہاں گیا تو سونے کے کمرہ میں ملے۔ دروازہ کے پاس ہی ایک صوفہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کمزوری مزید تھی۔ لیکن چہرہ روشن تھا، گفتگو آہستہ آہستہ کرتے تھے۔ لیکن آواز میں خستگی نہ تھی۔ دیر تک بات کرتے رہے جس میں ہراس یا مایوسی کا شائبہ تک نہ تھا۔ کہنے لگے رشید جو کچھ ہونا ہوتا ہو جو ہونے والا ہے۔ وہ ہو کر رہے گا۔ لیکن یہ تمہارا حکیم بڑا بے نظیر آدمی ہے۔ خدا اسے خوش رکھے کیا کوئی عزیز کرے گا جو اس نے کیا۔ ایسے لوگ اب

کہاں۔ بڑا سمجھدار آدمی ہے۔ صاحب فن کی حیثیت سے میں نے اُسے گھبراتے نہیں دیکھا۔ محبت کی وجہ سے البتہ پریشان ہونے لگتا ہے۔ نوجوان ہے نا۔ عمر گزرنے پر یہ بات جاتی رہے گی۔

مرحوم کی وفات کے بعد ایک دن حکیم صاحب سے گفتگو ہوئی تو وہ بھی تعجب کرتے تھے کہ ایسے پکے عقیدہ کا مریض انہوں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ کہتے تھے مرحوم کے مزاج کی عجیب کیفیت ہو گئی تھی۔ ان کا علاج اُس وقت تک کوئی کر ہی نہ سکتا تھا جب تک کہ ان کے اعضائے رئیسہ کی عجیب و غریب و بسا اوقات متضاد و جلد جلد بدلنے والی کیفیات سے پورے طور پر آشنا نہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ ادویات تجویز کرنے میں بھی اس کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا۔ کہ کون سی دوا کس حد تک مفید ہو گی۔ اور کہاں پہنچ کر وہ مرحوم کے مزاج سے بے آہنگ ہو جائے گی۔ جب مرض کی شدت غالب آنے لگتی ہے تو اکثر طبیب کو بھی استدادی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ضابطہ دوا اور طریق علاج سے ہٹ کر بعض کارروائی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ دواؤں سے اعضاء پر کوئی ردعمل نہ ہوتا تھا اور تھوڑا بہت ہوتا بھی تھا تو نقصان کی طرف ہوتا تھا۔

حکیم صاحب کہتے تھے کہ میں نے یہ محسوس کر کے کہ ممکن ہے مرحوم میرا لحاظ کر کے کچھ نہ کہتے ہوں۔ ایک دن میں نے دبی زبان سے یہ کہہ دیا کہ مولینا اب معالج بدل کر دیکھا جائے۔ کیا ہوتا ہے ممکن ہے مرض میری سمجھ میں نہ آتا ہو یا میری تدابیر کارگر نہ ہوتی ہوں۔ حکیم صاحب کہتے تھے مولینا پر ایک کیفیت سی طاری ہو گئی، کہنے لگے حکیم یہ سمجھتے ہو گے کہ مولوی مر گیا۔ تو لوگ کہیں گے کہ حکیم صاحب کے علاج سے مرا۔ خبردار خبردار مت گھبرانا علاج تمہارا ہی رہیگا۔ مارنا جلانا تمہارا کام نہیں ہے یہ تو کوئی اور کرتا ہے۔ تم فکر مت کرو۔ علاج کئے جاؤ۔ بہت ٹھیک علاج کر رہے ہو۔ مجھ سے زیادہ کون جانے گا کہ علاج کیسا ہو رہا ہے۔ علاج تھا

تک نہیں بدلا جائے گا۔ سمجھے نا؟ ہاں!

ہر شخص نے حتیٰ کہ مولانا مرحوم کے ایسے دوستوں نے جن کو وہ نہایت محترم و عزیز رکھتے تھے اصرار کیا کہ علاج بدل دیا جائے۔ مرحوم نہ مانے اور ہمیشہ یہ کہتے رہے تم لوگ میرے حکیم کو کیا سمجھتے ہو۔ بڑے معرکہ کا علاج کر رہا ہے۔ میں اپنی جگہ پر بالکل مطمئن ہوں۔ حکیم صاحب فرماتے تھے کہ مولینا نے ایک بار فرمایا تھا کہ حکیم اب کے تو جانبر ہو گیا۔ اب بخار آیا تو پھر نہ اُترے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔

پچھلی عید میں مرحوم نے مسجد میں نماز پڑھی۔ کمزور ہو چکے تھے۔ میرا اور بعض دوستوں کا مدت سے یہ معمول چلا آتا تھا کہ مسجد سے واپسی پر سب سے پہلے دو منزلہ آتے اور مرحوم سے مل کر اپنے اپنے گھروں کو واپس جاتے۔ گزشتہ عید کے موقع پر پہنچا تو مرحوم ملاقات کے کمرہ میں احباب و عقیدت مندوں کے ہجوم میں کھڑے تھے۔ اسی وقت مسجد سے واپس آئے تھے۔ تھکن سی محسوس کر رہے تھے۔ فرمایا بھائی معانقہ سے معاف کرو، دم لینے کرسی پر بیٹھ گئے اور مصافحہ کرنے لگے۔ میں پہنچا تو اٹھ کر بغل گیر ہوتے۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا اور اپنے لمبے چوڑے سرخ چھتے وار رومال سے پیشانی سے بار بار پسینہ پونچھتے تھے لیکن چہرہ پر بشاشت تھی اور آواز میں کراراپن، مرحوم آواز کے لئے اکثر یہ لفظ (کراراپن) استعمال کرتے تھے۔

ماہ صیام آ رہا ہے۔ عید بھی آئے گی۔ اس وقت جب کہ یہ سطر میں لکھ رہا ہوں رمضان کے کتنے مہینے اور عید کی کتنی تقریبیں یاد آ رہی ہیں۔ تراویح کے بعد مرحوم کے ہاں کی وہ صحبتیں جب چائے کا دَور ہوتا تھا۔ مخلصین کا مجمع، لطف کی باتیں۔ مرحوم کی باتوں میں وقت کتنا جلد جلد گزرتا تھا۔ جو کوئی آتا اس پر محبت کا کوئی فقرہ چست کرتے۔ چائے کی پیالی

پیش کی جاتی۔ کسی کے حلیہ پر کوئی فقرہ کہہ دیتے۔ کسی کے لباس کی تعریف کر دیتے۔ کسی کی گلکاری
کی داد دیتے۔ کبھی کبھی کسی علمی مسئلہ پر کسی کی رائے لیتے اور مذاق ہی مذاق میں اس کے بعض نازک
پہلو اس طور پر بیان کر جاتے۔ گویا وہ بات بھی اُس صحبت کی تفریحی گفتگو کا ایک جزو تھی۔ عید کی نماز
سے واپسی پر حلقۂ احباب گرم ہوتا جاتے۔ عطر و پان سے ہر ایک کی تواضع کی جاتی۔ ہر شخص
کے مذاق کو مدِنظر رکھ کر اس سے پرسشِ احوال کرتے۔ کالج پالیٹکس پر کبھی مجمع میں اظہارِ خیال
نہ کرتے اور نہ کسی کو اس قسم کے مسائل چھیڑنے کی ہمت ہوتی۔

دوسری بار مرحوم علیل ہوتے تو روز بروز حالت گرتی ہی گئی۔ اس دوران میں عرصہ
تک میں حاضر نہ ہو سکا۔ دریافت کرنے پر ہمیشہ یہی معلوم ہوا کہ کمزوری بڑھتی جاتی ہے اور مرض
قابو میں نہیں آ رہا ہے۔ اس حالت میں مرحوم کو دیکھ نہ سکتا۔ جس شخص کو تندرستی، زندہ دلی، استقلال
و استقامت کا جیتا جاگتا نمونہ دیکھ چکا تھا۔ اسے بے بس و ناتوان دیکھنا میرے بس کا نہ تھا۔
ایک دن مکان پر ایک اہم کام میں مصروف اور پرو وائس چانسلر صاحب کے خط کا منتظر تھا۔
کہ نوکر نے آکر خبر دی کہ مولینا صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ حکیم صاحب اور دوسرے لوگ
وہیں گئے ہوتے ہیں۔ زبان سے بے ساختہ انا للہ نکلا۔ گرتا پڑتا دو منزلہ پہنچا۔ ہجوم دیکھ کر
دل بیٹھ گیا۔ کمرہ میں سب لوگ جمع تھے۔ کئی ڈاکٹر بھی بلا لئے گئے تھے۔ مشورہ ہو رہا تھا۔
معلوم یہ ہوتا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ غفلت طاری رہنے لگی ہے۔ کبھی کبھی ہوش میں آ
جاتے ہیں۔ علاج بدلنے پر اب بھی تیار نہیں ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ جو کچھ ہونے والا ہے اُسے
اب کوئی ٹال نہیں سکتا۔ علاج بدلنا نہ بدلنا دونوں برابر ہیں۔ دل البتہ نہیں مانتا۔ شاید ڈاکٹری
علاج سے نقشہ بدل جاتے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر جو مرحوم کے سب سے بڑے
مقرب و محرم تھے اندر تشریف لے گئے۔ میری اب بھی ہمت نہ ہوتی کہ اندر جاتا۔ مرحوم کی حالت

غیر ہو چکی تھی لیکن پہلے حکیم صاحب سے پوچھا حکیم تم بھی چاہتے ہو کہ علاج بدل دیا جائے۔ حکیم صاحب
نے کہا ہاں۔ فرمایا تو پھر جو چاہو کرو۔

یہ سوچ کا تو دل کڑا کر کے میں بھی حاضر ہوا۔ کسی نے میرا نام لے کر با آواز بلند کہا کہ فلاں آیا ہوا
ہے۔ مرحوم نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ مرحوم نے مجھے دیکھ کر پہچانا ہو۔ حاضرین
میں سے ایک صاحب نے پھر یاد دلایا کہ فلاں آیا ہوا ہے۔ نہایت خفیف آواز میں فرمایا۔
"آپ آئے ہو . . . . . بڑی دیر کر دی" اس کے بعد آنکھیں بند کر لیں۔ ذری ہی دیر
میں پھر ہوشیار ہوتے فرمایا "یہ کیا ہو رہا ہے"۔ یہی تین فقرے تھے جو میں نے سنے۔

کچھ دیر تک میں کمرہ میں مرحوم کی چارپائی سے لگا بیٹھا رہا۔ موت کا تصور کبھی کبھی ماضی
کے دھندلے نقوش کو بہت زیادہ نمایاں کر دیتا ہے۔ اتنا نمایاں گویا ان میں از سر نو زندگی
ڈال دی گئی ہے۔ مجھے پچھلا زمانہ ایک ایک کر کے یاد آنے لگا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں اٹھارہ سال
قبل میں رہ چکا تھا۔ مرحوم نے ایک دن اس زمانہ میں مجھ سے فرمایا کہ اس عمارت کے دو حصوں
میں ہم دونوں آباد ہیں میرے لئے موجودہ حصہ ناکافی ثابت ہو رہا ہے۔ بھائی جان کو بھی تکلیف
ہے۔ اگر یہ حصہ بھی مل جاتا تو ہم لوگوں کے لئے بڑی آسانی ہو جاتی۔ میں اسٹاف میں آ گیا
تھا۔ اس لئے بڑی آسانی سے مجھے اور کمرے مل گئے اور میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔ مجھے
وہ زمانہ یاد آ رہا تھا۔ اس کمرہ میں معلوم نہیں کیسے اور کیوں وہ باتیں یاد آنے لگیں جن سے
زندگی کے بعض بڑے دلکش نشیب و فراز وابستہ تھے۔ اپنے ہی نہیں مرحوم کے بھی۔ ان کے
دہرانے سے کیا حاصل۔ یہ وہ کمرہ تھا جس میں مرحوم بڑے شوق سے آتے تھے۔ اس میں ان کے
شوق کی تمام چیزیں رکھی ہوتی تھیں۔ یہیں وہ بے تکلف اور مخلص احباب سے بڑے شوق سے
ملتے تھے۔ اور ——— یہیں سے وہ آج بہ شوق سے رخصت ہو رہے تھے۔ وہ شخص جو

دوسروں کے لئے سہارا تھا۔ آج ہر سہارے سے بے نیاز ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں جن میں زندگی خلوص اور سرداری کی چمک تھی بے نور ہونے لگی تھیں جس سرچشمہ سے میں اور کتنے اور تقویت اور بشاشت حاصل کیا کرتے تھے وہ خشک ہو رہا تھا ہمیشہ کے لئے خشک!

میں بیٹھا رہا۔ مرحوم کی حالت دیکھ کر طبیعت بے اختیار ہونے لگی۔ جی چاہتا کاش مولانا یک لخت تندرست ہو کر بیٹھ جاتے اور کہتے خوب آئے بیٹھو گپ ہو گی۔ کدو اب بڑا ہو گیا۔ ناچے گا نہیں۔ پان کھاؤ۔ ایک مجھے بھی دینا" میری وہ حالت تھی جب آدمی دعائیں مانگتا۔ شاید مانگ بھی نہیں سکتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ دعا مانگنا عبث ہے۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ ہر چیز دگرگوں ہو جاتے۔ ناممکن ممکن ہو جاتے۔ یہ خواہش دعا مانگنے سے بھی زیادہ عبث ہے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں یہ بات جتنی ناممکن ہے اتنی ہی فطری بھی معلوم ہوتی ہے۔

میں چلا آیا اور پھر نہ گیا۔ دو دن بعد مولانا سلیمان اشرف صاحب کا انتقال ہو گیا!!

اور اللہ نے اپنے بہادر کو ہم میں سے اٹھا لیا!

جنازہ کے ہجوم میں قبرستان پہنچا۔ قبرستان سے متصل میدان میں نماز کے لئے جنازہ رکھ دیا گیا اور ان لوگوں کا انتظار کیا جانے لگا جو دفن میں شریک ہونے کے لئے دوڑتے بھاگتے چلے آ رہے تھے۔ نماز پڑھانے کا سب سے زیادہ حق نواب صدر یار جنگ بہادر کو پہنچتا تھا۔ اچانک علالت کے سبب سے موصوف تشریف نہ لا سکے۔ مولینا ابوبکر صاحب منہ کے زخم رہنے کے سبب سے معذور تھے۔ چنانچہ مولانا شفیع صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اس وقت جب کہ نماز جنازہ کا مسئلہ زیر غور تھا مجھے مرحوم کی ایک بات یاد آ گئی۔ عرصہ ہوا مولینا نے مجھ سے ایک بار فرمایا تھا دیکھو دینیات کے پرچے میں جو نماز جنازہ کا سوال میں ہمیشہ رکھ

دیتا ہوں۔ اس کا سبب جانتے ہو۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو فرمایا کہ ہر مسلمان جو اپنے مرحوم بھائی کے ساتھ آخری سلوک کر سکتا ہے وہ نماز جنازہ ہے۔ میں مرنے لگوں گا تو مجھے یہ تو اطمینان رہے گا کہ میرا ہی کوئی عزیز طالب علم میری نماز جنازہ پڑھائے گا!

اس وقت جب کہ یہ نہیں طے ہو رہا تھا۔ کہ نماز جنازہ کون پڑھائے۔ مجھے مرحوم کی بات بے اختیار یاد آئی اور یہی جی چاہا کہ مرحوم ہی کا کوئی شاگرد نماز پڑھائے۔ کاش میں ہی پڑھا سکتا۔ لیکن توفیق ہوئی تو بس اتنی کہ جس جگہ مجھے نماز جنازہ پڑھانی چاہیئے تھی۔ وہیں تعزیت کا ریزولیوشن پڑھ کر گھر واپس آگیا اور نماز جنازہ کا بدل تعزیت کا ریزولیوشن رہ گیا!

مولانا ابوبکر صاحب مرحوم

مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ
کیا دوانے نے موت پائی ہے!

مولانا الحاج ابوبکر محمد شیث فاروقی جونپوری ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے۔ نہ دعائیں مقبول ہوئیں نہ دوائیں کارگر۔ وقت ٹلتا رہا۔ لیکن انجام وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ دلی تمنا تھی کہ یہ نہ ہوتا لیکن مشیت الٰہی کو کون سمجھ یا ٹال سکا ہے!

آہ وہ زندانیٔ تقدیر (انسان) جسے بانیٔ تقدیر بھی کہتے ہیں!

مولٰینا میرے ہم وطن تھے۔ کیا بتاؤں کہ میں ان کو کب سے جانتا ہوں۔ ان کی شخصی خوبیوں کو بچشم خود دیکھا۔ ان کے بزرگوں کی برگزیدگی اپنے بزرگوں سے سُنی۔ کتابوں میں پڑھی اور دلوں میں پائی۔ ابتدائی باتیں تو حافظہ کے دُور دراز افق پر کسی پرندہ کی موہوم پرواز کی مانند گم ہوتی جارہی ہیں۔ اب ان کو کون واپس بُلائے، کس دل سے بُلائے اور بلانے سے حاصل ہی کیا!

علی گڑھ نے کسی کام کا نہ رکھا، اُس نے اپنا بنا لیا، یہ بڑا ہی سخت گیر اور شکّی محبوب ہے نہیں چاہتا کہ اُس کے ادنیٰ مطالبات سے گریز کیا جائے۔ یا اس کے سوا کسی اور سے التفات کیا جائے۔ اُس نے مجھے میری نظر میں محترم کر دیا۔ اس قید سے مخلصی کہاں۔ بہت سی باتوں میں اب نہ علی گڑھ سے بہتر و برتر مجھے مقام نظر آتا ہے اور نہ علی گڑھ والوں سے بہتر و برتر لوگ۔ جب کسی اچھے آدمی سے ملاقات ہوتی ہے تو معاً دل میں سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہ علی گڑھ کا ہے یا نہیں؟ نہیں ہوتا تو افسوس ہوتا ہے کہ ایسا اچھا آدمی علی گڑھ کے فیضان سے محروم رہا اور جب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں کا ہے تو فخر سے گردن اونچی اور مسرت سے دل لبریز ہو جاتا ہے۔ یہ دل کا ایک راز تھا جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

پندرہ سولہ سال ہوئے یونیورسٹی میں ناظم دینیات کی جگہ خالی ہوئی میرے ذہن میں یک لخت یہ بات آئی۔ کہ مولٰینا یہاں آجائیں تو خوب ہو۔ حسن اتفاق سے جلد ہی جانے کا موقع ملا۔ مولٰینا نے استمزاج کیا۔ اب تک یاد ہے مولٰینا ایک کھرّی چارپائی پر لیٹے ہوئے بستر پر سر رکھے بیٹے عالم شوق میں کچھ اشعار پڑھ رہے تھے۔ میں نے پہنچ کر سلام کیا تو وعلیکم اس لطف سے کہا جس سے

محسوس ہوا کہ میرے آنے کی مولینا کو بڑی خوشی ہوئی اور سلام کا یہ جواب ایک طویل اور پُر خلوص صحبت کی دعوت ہے۔ ہر ملنے والے سے خواہ وہ اجنبی اور نو وارد ہی کیوں نہ ہو مولینا کا یہی انداز پذیرائی تھا۔ خود اٹھ بیٹھے اور مجھے بھی اپنی ہی چارپائی پر بٹھا لیا۔ اپنے لمبے رومال کو جو پاس ہی رکھا تھا اس طور پر گھسیٹتے اٹھایا کہ جس جگہ میں بیٹھنے والا تھا۔ اس کو جھاڑ پونچھ دینا مقصود تھا۔ قدیم زمانہ کے بزرگوں کا یہ خاص انداز تھا۔ بولے کہو علی گڑھ کا کیا حال ہے۔ کب آئے؟ میں نے کہا مولینا ایک بات کہنے کو جی چاہتا ہے۔ بولے کہو، ضرور کہو، وہ ان کا مستعدی اور ولولہ سے اس طور پر ہمہ تن تیار ہو جانا جیسے ضرورت ہو تو کام پورا کرنے کے لئے وہیں سے میرے ساتھ ہو جائیں۔

میں نے کہا علی گڑھ میں "ناظم دینیات" کی جگہ خالی ہے۔ آپ قبول کر لیتے تو بڑا اچھا ہوتا۔ کہنے کی یوں ہمت نہیں پڑتی کہ آپ کا سیاسی مسلک اور ہے، علی گڑھ کا اور۔ فرمایا مسلک کی تو کوئی بات نہیں۔ مسلک تو ایک ہی ہے اور وہ مسلک ہے اسلام کا۔ میں نے کہا یہ تو میں سمجھتا ہوں لیکن یہ کون سمجھائے اور سمجھے کہ کون سا مسلک کیا ہے۔ بولے سمجھنے سمجھانے سے کچھ نہیں ہوتا، کرنے دھرنے سے ہوتا ہے، صحیح اور سچا راستہ دریافت کرنے اور اس پر چلنے میں تو ممکن ہے دقت ہو لیکن صحیح اور سچا آدمی بڑی آسانی سے پہچانا جاتا ہے۔ تمہارا علی گڑھ "مصالح" کا شکار ہے، مصلحت اندیشی اچھی چیز ہے لیکن مصلحت پرستی تنزل کی جڑ ہے۔ کچھ دیر تک اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ مولینا تو پھر بسم اللہ علی گڑھ تشریف لے چلئے۔ وہاں آپ کی بڑی ضرورت ہے۔ بولے کیا مضائقہ لیکن میں دوڑ دھوپ کرنے اور سفارش بہم پہنچانے کے چکر میں نہ پڑوں گا۔ میں نے کہا یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے میں تو صرف آپ کا عندیہ لینا چاہتا تھا۔

میں چلنے لگا تو بولے دیکھو اس سلسلہ میں کوئی بات ایسی نہ کرنا جو تمہارے یا میرے شایان
شان نہ ہو۔ میرا شمار کچھ بہت کھاتے پیتے لوگوں میں نہیں ہے لیکن روپیہ پیسہ کے علاوہ اللہ کا دیا اور
بزرگوں کا سپرد کیا ہوا اور بہت کچھ موجود ہے مجھے نہ نوکری کی خواہش ہے اور نہ ضرورت۔ تم کہتے ہو
کہ علی گڑھ چلوں، میں بھی سوچتا ہوں کہ کچھ دن یہ شغل بھی رہے تو کیا ہرج۔ علی گڑھ والوں کو قریب
سے دیکھنے سمجھنے کا موقع ملے گا۔ پھر تم ہو، ایوب ہیں وغیرہ وغیرہ۔
یاد نہیں آتا کون لوگ اور موجود تھے کس نے کہا، اور کیوں، مولینا آپ کی اور مولینا سلیمان
اشرف صاحب کی کیسے نبھے گی، مولانا نے فرمایا، بھائی ٹھیک کہتے ہو، یہ بات میرے ذہن میں نہیں
آئی تھی۔ میرے ان کے بعض امور میں اختلافات ضرور ہیں لیکن وہ جون پور میں مدتوں رہے ہیں۔
ہم دونوں ایک دوسرے سے واقف بھی تو ہیں۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ علی گڑھ جا کر وہ کیا سے کیا
ہو گئے۔ لیکن اتنا ضرور یقین ہے کہ وہ میری مخالفت نہ کریں گے۔
میں علی گڑھ واپس آ گیا۔ سب سے پہلے مولینا سلیمان اشرف صاحب مرحوم سے ملا
دیکھتے ہی بولے، کہو پاکٹ میں کچھ ہے؟ اس سے مرحوم کا مطلب یہ ہوتا، کوئی لطیفہ، ذہن میں ہے
ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے کہا، ایک بات آپ سے منوانے کے لیے حاضر ہوا ہوں بولے
شاباش اچھے گھر بیعنہ دیا ہے، ارے سلیمان اشرف سے بات منواتا، تم کو کسی نے بہکایا ہو گا۔
میں نے کہا مولانا بہکایا کسی نے نہیں، یہ آپ یقین فرمایئے، بولے تو پھر ٹھیک ہے، خود ہی بہکے
ہو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میں نے کہا مولانا، یہ بہکنے بہکانے پر آپ اتنا زور کیوں دے
رہے ہیں۔ میں خود بہکا یا گیا ہوں آیا تو آپ ہی کے پاس۔ پھر بھی کوئی بہکنے میں ہلکا ہوا! مرحوم
بڑے زور سے ہنسے پھر فرمایا اچھا اچھا کہو، بارش با باہم بازی، ہاں ہم سمجھا، کہو کیا کہتے ہو۔
میں نے ناظم دینیات کے تقرر کے سلسلہ میں مولانا ابوبکر صاحب کا نام لیا اور اس کے بعد ہی

اُن کے محاسن زبان پر لانا چاہتا تھا۔ کہ بولے، اچھا، اچھا، ذرا چپ نہ ہو جاؤ۔ مولوی ابوبکر سے میں واقف ہوں، میرے اُن کے مسلک میں فرق ہے، تم کو یہ باتیں معلوم نہیں، لیکن وہ آدمی اونچے گھرانے کا ہے، پھر غور میں پڑ گئے، تھوڑی دیر تک ہاتھ پیچھے باندھے ٹہلتے اور گنگناتے رہے۔ اس کے بعد بولے، اچھا جاؤ۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں سے مشورہ کر کے بتاؤں گا۔

کچھ ہی دن بعد مولانا بالاتفاق رائے ناظم دینیات مقرر ہو گئے، پندرہ سال تک مولانا نے جس لطف و ہمدردی، وسیع النظری، انتظامی قابلیت اور عالمانہ رکھ رکھاؤ سے اس منصب کے فرائض انجام دیتے اس کی نظیر علی گڑھ کے محکمۂ دینیات کی تاریخ میں میری نظر سے نہیں گزری۔ گو یہ ان کے فرائض منصبی میں نہ تھا لیکن پانچوں وقت کی نماز پابندی کے ساتھ خواہ کوئی اور کیسا بھی موسم ہو، یونیورسٹی میں تعطیل ہو یا نہ ہو مسجد میں پڑھتے۔ اس میں حتی الوسع کبھی ناغہ نہیں کیا۔ "دینیات کی لائبریری" از سرِ نو مرتب کی۔ دینیات کے نصاب پر نظرِ ثانی کی مسجد اور متعلقہ عمارات کو ستھرا اور دیکھنے کے لائق بنائے رکھا۔ جتنے دارالاقامہ یونیورسٹی اور اسکول سے متعلق تھے ان میں نماز پڑھنے پڑھانے کا باضابطہ انتظام کیا۔ یونیورسٹی میں مذہبی و اخلاقی فضا پیدا کرنے میں انتہائی خلوص و تدبر سے کام لیا۔

مذہبی و اخلاقی و تہذیبی اور ... [illegible] ... مرحوم کا نظریہ اس بارہ میں سب سے علیحدہ ... [illegible] ... تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ علی گڑھ اصطلاحی معنوں میں کوئی دینی یا مذہبی ادارہ نہیں ہے۔ جن معنوں میں دیوبند، سہارنپور وغیرہ کے مذہبی یا دینی ادارے ہیں۔ یہ ایک دنیوی تعلیم گاہ ہے۔ جس میں طلبا کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے۔ جو ضروریاتِ زمانہ میں ان کی کفیل ہو۔ اور دنیوی مطالبات پورا کرنے میں ان کی مدد کرے۔ اس کے ساتھ

ساتھ یہ مسلمانوں کا بھی ادارہ ہے۔ اس لئے اس میں صرف اتنا لحاظ رکھنا چاہئے کہ ہمارے طلباء اسلام کے اعلیٰ تصورات معاد و معاشرت سے آشنا رہیں اور علوم جدیدہ یا معاشرہ حاضرہ کی زد میں آ کر اسلامی شعائر و اسلامی روایات سے بیگانہ نہ ہو جائیں۔ یونیورسٹی میں عبادت سے زیادہ اعتقاد کو صحیح رکھنے کا التزام رکھنا چاہئے۔ اُس کے بعد منزل یہ ہے کہ اعتقاد عمل کی کسوٹی پر کھرا ثابت ہو۔ جس اعتقاد پر عمل کا جامہ ٹھیک نہ آئے وہ اعتقاد نہیں ذہنی تعیش یا گمراہی ہے۔ مسلمانوں کا عمل عبادت ہے عبادت، عمل نہیں، یہاں یہ چیز ہمارے آپ کے عمل سے پیدا ہو سکتی ہے۔ قواعد کے شکنجوں یا تعزیرات کے خوف سے نہیں۔ مسلمان بنے رہے مسلمان بنتے رہیں گے، قواعد قانون بدلتے رہیں گے۔

مرحوم کا سیاسی مسلک جمعیتہ العلماء کا تھا اور جہاں تک شعائر اسلامیہ کا تعلق تھا۔ وہ بدعات شرعیہ کے سخت مخالف تھے۔ فاتحہ، پیر پرستی اور اس قسم کی دوسری باتوں کے بالکل قائل نہ تھے، ہندوستان کی آزادی کے وہ بڑے حامی تھے۔ تمام عمر ان کا لباس گزہی گاڑھے کا رہا۔ سر پہ عمامہ اور پاؤں میں پنجابی جوتا۔ صرف سخت سردیوں میں کوئی معمولی سا موزہ پہن لیتے۔

مجھے یاد آتا ہے ایک صحبت میں جمعیتہ العلماء اور کانگرس کے سیاسی مسلک پر گفتگو چھڑی ہوئی تھی۔ مرحوم چبوترہ پر اپنی عبا اور عمامہ سر کے نیچے رکھے ہوئے لیٹے تھے۔ حاضرین میں سے کسی شخص نے جو جمعیتہ العلماء اور کانگرس دونوں سے بیزار تھا۔ جمعیتہ کے سیاسی مسلک پر نکتہ چینی کی۔ مولینا اٹھ بیٹھے، کہنے لگے بھائی انصاف کرو اور حد سے متجاوز نہ ہو۔ علماء میں ہزار عیب سہی لیکن انہوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کی کوشش میں کچھ کم حصہ نہیں

لیا ہے۔ آج کل لوگ زیادہ تر تقریر کرتے ہیں، تجویز پیش کر دیتے ہیں یا سنیا گرہ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی ایسے زمانہ میں جب حکومت کی مخالفت کرنا کچھ بہت زیادہ نقصان رساں یا تکلیف دہ نہیں ہے۔ علماء نے تو اس وقت سے "آزادی کا علم" بلند کر رکھا ہے۔ جب ہندوستان میں آزادی کے نام سے بھی کوئی آشنا نہ تھا اور آزادی و بغاوت ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے تھے۔ کانگریس کے نام تک سے کوئی واقف نہ تھا۔ علماء پھانسی پر چڑھائے گئے ان کے گھر ڈھائے گئے۔ ان کو کالا پانی بھیجا گیا۔ ان کے عورتوں بچوں پر طرح طرح کے ظلم توڑے گئے۔ تم لوگ تو ہندوستان کی تاریخ سے واقف ہو۔ کچھ بیچارے علماء کی بھی تاریخ پڑھی ہوتی۔ آج ہندو آزادی کے معاملہ میں اپنے آپ کو سب سے اونچا اور سب سے آگے سمجھتے ہیں۔ لیکن کوئی ہندو آزادی کے معاملہ میں علماء سے آنکھ برابر نہیں کر سکتا۔

مولانا نے اس سلسلہ میں ہندوستان کی تاریخ جہاد پر بڑی مسلسل اور دل نشیں تقریر کی۔ علماء کے بہت سے تباہ شدہ خاندانوں کا حال سنایا۔ جہاد پر جو نظمیں جب کبھی لکھی گئی تھیں اور ضبط ہوئیں ان سب کو سنایا۔ جہاد کی تحریک جس طور پر شروع ہوئی، جو لوگ شریک ہوئے اور ان کا جو کچھ انجام ہوا سب سنائے، پھر بولے دوستو برا نہ ماننا۔ تمہارے مصالح یا تمہاری کمزوری اپنی اپنی جگہ پر چاہے جیسی ہو مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں لیکن ایسا تو نہ کرو کہ جن لوگوں نے ہندوستان اور اسلام کی آزادی میں مصالح کو ٹھکرا دیا۔ ان کو تم ٹھکراؤ۔ زندگی کے لطف اٹھاتے ہو خوب اٹھاؤ۔ خدا مبارک کرے اور برکت دے۔ مگر ایسی بات منہ سے نہ نکالو جس سے کبھی تم کو اپنے اسلاف کی روحوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے!

مولانا کی اس تقریر سے حاضرین پر اوس سی پڑ گئی۔ لیکن اس کے بعد ہی مولانا نے گفتگو کا رخ اس طور پر بدل دیا۔ کہ بات آئی گئی ہوئی اور سب لوگ ہنستے بولتے رخصت ہوئے۔

مرحوم نے یہ تقریر کچھ یوں ہی نہیں کردی تھی بلکہ اس کی تہ میں مرحوم کے خاندان کی بعض روایات بھی ہیں۔

مولینا کے دادا مولینا سخاوت علی فاروقی محمدی مہاجر مکی تھے۔ ممدوح شاہ عبدالحی صاحب دہلوی اور امیر المجاہدین مولینا شاہ محمد اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ کے شاگرد تھے۔ اور امیر المومنین حضرت سید احمد شہید بریلوی کے خلیفہ ان شہیدین سعیدین کے فیض صحبت سے مولانا سخاوت علی رحمۃ اللہ علیہ میں مجاہدانہ سرگرمیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ چنانچہ ۱۸۵۶ء میں یہ مرد مجاہد ہندوستان کو دارالحرب سمجھ کر مکہ معظمہ کو ہجرت کر گیا۔
مولانا سخاوت علی مرحوم کا قائم کیا ہوا مدرسہ قرآنیہ اب بھی جون پور میں قائم ہے جس کی ترقی و نگرانی بتدریج مولانا ابوبکر صاحب مرحوم کے چچا مولانا محمد عبد صاحب مرحوم اور ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی اور مرحوم کے والد ماجد مشہور عالم باعمل حضرت مولینا ابوالخیر محمد مکی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد ہوئی۔ جن کے بعد مولینا مرحوم اس مدرسہ کے مہتمم و ناظم ہوئے۔
مولانا سخاوت علی مرحوم نے اپنے عہد میں جیسے جیسے نازک موقع پر دین کی خدمت کی۔ اور ان کے فیض صحبت سے جیسے جیسے علمائے دین پیدا ہوتے۔ وہ پورب کے نواح میں بچہ بچہ کی زبان پر ہیں۔

جس صحبت کا اوپر ذکر آیا ہے میں اس میں موجود تھا اور پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ کہ مولینا جو کچھ فرما رہے ہیں اس میں اس حرارت کا بڑا دخل ہے جو مولانا کو براہ راست وراثۃً پہنچی تھی۔

مولانا کا بڑا وصف یہ تھا کہ وہ ہر کام خواہ اپنا ہو یا پرایا بڑی خوش دلی اور مستعدی سے انجام دیتے تھے اور کسی کو محسوس بھی نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ اپنے یا کسی کے کام میں لگے ہوئے ہیں بعضوں کا شعار یہ ہے کہ وہ اپنا یا دوسرے

کا کام کریں گے تو اس کا موقع بے موقع اعلان بھی کرتے رہیں گے کبھی مصروفیت سے کبھی ناسازی طبع سے کبھی اپنے نقصان سے کبھی کوئی اور کام نہ کرنے کے بہانہ سے۔ پھر کر چکیں گے تو احسان منوانے یا اپنی اہمیت و عظمت جتانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیں گے۔ اکثر ایسے بھی ملیں گے جو ادنے اسا کام کریں گے جس کے کرنے کا ان کو کافی معاوضہ بھی ملتا ہے لیکن اس کا اعلان و اظہار اس طور پر کریں گے گویا کوئی بہت بڑی قربانی کر رہے ہیں۔ یا ان پر بہت بڑا ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔ مرحوم اس کے بالکل برعکس تھے۔ معمولی سے معمولی کام ہو یا بڑے سے بڑا وہ اس کو اس طور پر کرنا شروع کر دیتے جیسے ہم آپ غیر شعوری طور پر سانس لیتے ہیں، بغیر کسی قسم کا اعلان کئے اور بغیر کسی معاوضہ کے توقع کے اور ختم کرتے تو بس ختم کر دیتے۔ بعد میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔

شعبہ فنون کے ایک طالب علم نے "اکیڈمک کونسل" سے ایک بار ایسے مضامین اختیار کرنے کی اجازت چاہی۔ جو مقررہ اوقات تعلیمی میں مخل ہوتے تھے۔ کونسل میں اس مسئلہ کے ہر پہلو پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اراکین نہ تو یہ چاہتے تھے کہ ٹائم ٹیبل کے وقتوں میں اضافہ ہو۔ اور نہ اس طالب علم کی درخواست کو اسی بناء پر مسترد کرنا گوارا کرتے تھے۔ جب کافی بحث ہو چکی تو مولانا نے فرمایا۔ کہ کونسل اجازت دے دے جس مضمون کے تعلیم کی گنجائش نظام اوقات میں نہیں نکلتی وہ مرحوم کے سپرد کر دیا جائے۔ وہ اپنے مقررہ گھنٹوں کے علاوہ اس طالب علم کو پڑھا دیں گے چنانچہ اس طالب علم کو مولانا نے دو سال تک مسلسل انتہائی پابندی و انہماک سے اپنے خدمت کے اوقات میں تعلیم دی۔

اپنے عملہ میں مولانا کو بعض بڑے نالائقوں سے بھی سابقہ ہوا لیکن وہ ان سے اس طرح پر نباہ کرتے تھے کہ ہر شخص کو حیرت ہوتی تھی۔ مؤذنوں اور پیش اماموں کی بڑی خبرگیری کرتے تھے۔ ان سے شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ یہاں تک کہ ان بیچاروں کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ

مولانا اُن کے افسر تھے۔ ان کے کاموں میں کبھی کوئی عیب یا نقص نہ نکالا۔ اُن کی ذاتی وقعتوں کو اپنا بنا لیتے۔ مولانا کے سپرد جو انتظامات تھے اُن کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ قسم قسم کے مسائل اور طرح طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑتا۔ لیکن میں نے کبھی نہ دیکھا کہ مولانا کسی قسم کے تردد یا دوادوش میں مبتلا ہوتے ہوں۔ کمیٹیاں ہو رہی ہوں، کاغذی گھوڑے دوڑائے جا رہے ہوں۔ اور ایک ہنگامہ برپا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مولینا کی منشا خود بخود ہر جگہ پوری ہو رہی ہے۔ اور مولانا کا ہر ماتحت یا ان کے ساتھ کام کرنے والا اپنا ذاتی کام سمجھ کر ہر فرض سلیقہ اور محنت سے ادا کر رہا ہے۔

ایک دن ہم سب سید بشیر الدین صاحب مہتمم یونیورسٹی لائبریری کے آفس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا بھی اپنے خاص انداز دل آسائی و خود اعتمادی کے ساتھ آ گئے، سب لوگ تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ مولانا نے بغیر کسی تکلف یا مصنوعی اخلاق کے کہا ارے میاں بیٹھے بھی رہو، کیا باتیں ہو رہی تھیں، اور کیوں بشیر ہمارا "صاحب" کہاں ہے (یہ سید محمود حسین صاحب لیکچرر شعبہ انگریزی کی طرف اشارہ تھا) بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اثنائے گفتگو میں بشیر صاحب نے کہا کہ لائبریری کے قلمی اور مشرقی نسخوں کو حال ہی میں نیو لیکچرز روم سے لائبریری کو منتقل کیا گیا ہے۔ کتابیں بے ترتیب ہو رہی ہیں۔ ان کتابوں کی باقاعدہ فہرست بن جاتی تو بڑا اچھا ہوتا۔

مولانا نے فوراً فرمایا۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے یہ بھی کوئی کام ہوا، طفیل احمد سے کہو مجھے یہ ذخیرہ دکھا دیں۔ میں فہرست تیار کر دوں گا۔ بشیر صاحب نے کہا، مولانا بڑا پتہ مار کام ہے آپ کاہے کو تکلیف کریں۔ مولانا نے فرمایا بھئی ذرا دیکھوں تو سہی، جس کام کو نوجوان پتہ مار کہتے ہیں اُسے بڈھوں کو کم سے کم دیکھ تو لینا چاہیئے۔ غرض مولانا نے کام شروع کر دیا۔

کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ مدتوں مسلسل ہر روز کئی کئی گھنٹے لائبریری کے ایک گوشہ میں
بیٹھے کام کرتے رہے۔ اور بالآخر فہرست مکمل کر دی۔ مولانا نے کبھی اس کا بھول کر بھی ذکر نہ کیا۔
کہ وہ کس کام میں مصروف تھے۔ یہاں تک کہ کام ہمہ وجوہ مکمل ہو گیا۔ اس وقت بھی کسی سے
اس کا تذکرہ نہ کیا۔ ایک عرصہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مولانا نے فہرست مکمل کر دی تو میں نے
ہنس کر مولانا سے کہا، مولانا یہ آپ خواہ مخواہ کا درد سر کیوں خریدتے رہتے ہیں۔ کہنے لگے تم بھی
عجیب آدمی ہو۔ یہ بھی کوئی کام ہوا بشیر کو اس کی فکر تھی، میں نے کہا کام بھی اچھا ہے، فرصت
بھی رہتی ہے کچھ دن اسی کی سیر رہے۔ اس فہرست کے مرتب کرتے میں مجھ کو یہ فائدہ ہوا کہ بعض
نوادر کے دیکھنے کا مفت میں موقع مل گیا۔ اس ذخیرہ میں بعض ایسی کتابیں دیکھنے کو ملیں
جن کو میں سمجھتا تھا کہ ناپید ہیں، کسی کا صرف نام سنا تھا ان کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔ کچھ ایسی
بھی ملیں کہ اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آ گیا۔

اسی طرح دینیات کی لائبریری کو بھی مرحوم نے خود اپنے ہاتھ سے از سر نو ترتیب دیا۔
کتابوں کے انتخابات میں بڑی توجہ اور محنت سے کام لیتے تھے۔ علوم اسلامیہ پر جو کتابیں
بیرون ہندوستان شائع ہوتیں مولانا کی ان پر خاص نظر ہوتی۔ ہمیشہ اس فکر میں رہتے کہ
کون سی کتاب کہاں شائع ہوتی۔ اکثر پوچھتے رہتے کہ کس یورپین مستشرق نے اسلامی ادب،
شاعری، یا اس قبیل کی کسی اور موضوع پر تصنیفات شائع کیں۔ ان کے علاوہ مرحوم کو ان کتابوں
سے خاص دلچسپی ہوتی جو مذہبی مباحث پر اردو میں شائع ہوتیں۔

اکثر کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی زبان تو اردو ہوتی جا رہی ہے
کیونکہ براہ راست عربی فارسی سے استفادہ کرنے والے اب صرف وہ لوگ رہ گئے ہیں جو
تحقیقات علمیہ کا کام کرتے ہیں، ورنہ عام طور پر اب ساری مذہبی معلومات اردو ہی کی کتابوں

میں ملتی ہیں۔ مولانا کی وسعت نظر کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ان تمام اردو
کتابوں کو دینیات کی لائبریری میں جگہ دیتے تھے جو فلسفہ مذہب اخلاقیات یا اس قسم کے
دوسرے مباحث پر یورپین زبانوں سے اردو میں منتقل ہوتی تھیں۔ فرماتے تھے کہ اسلام کے
ابتدائی عہد میں یونانی کتب کے ترجمہ سے اسلامی تصورات میں جو انقلاب پیدا ہوا تھا۔
اس سے کہیں دُور رس نتائج موجودہ عہد میں پیش آنے والے ہیں کیونکہ فلسفہ کی ترقی سائنس
کے انکشافات مطبوعات کی اشاعت ملنے ملانے کی سہولتیں عوام و خواص دونوں کے ذہن و
افکار کو بڑی سرعت اور شدت سے متاثر کر رہی ہیں۔ اس لئے ان مطبوعات پر نظر رکھنا بڑا
ضروری ہے۔

یونیورسٹی کا قبرستان آج سے دس بارہ سال پہلے بے آب و گیاہ بالکل ویران پڑا ہوا
تھا۔ نہ کوئی سایہ دار درخت اور نہ وہاں پہنچنے کا ڈھنگ کا کوئی راستہ نہ نماز جنازہ پڑھنے کی
کوئی ستھری معقول جگہ، نہ محافظ قبرستان کے رہنے سہنے کا کوئی انتظام نہ میت کے لے جانے کے
لئے کوئی تابوت۔ اسی طرح یونیورسٹی کی مسجد میں کوئی وضو خانہ نہ تھا۔ لوگ حوض کے گرد
بیٹھ کر وضو کرتے تھے۔ ناک تھوک سے پانی کو پاک و محفوظ رکھنے کی کوئی صورت نہ تھی میت
کو غسل دینے اور کفنانے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ مولانا نے نہایت خاموشی اور مستعدی کے ساتھ
رفتہ رفتہ ان سب کا معقول انتظام کر دیا۔

گورستان کا اب یہ عالم ہے کہ شاید اس سے زیادہ سبز اور سایہ دار جگہ یونیورسٹی میں کوئی اور
نہیں ہے۔ صاف پختہ سڑک بن گئی ہے۔ محافظ گورستان مع تمام ضروری سامان کے ۲۴ گھنٹہ
وہیں موجود رہتا ہے۔ نماز جنازہ کی جگہ متعین ہے اور صفیں بنی ہوتی ہیں۔ اس کا بھی انتظام ہے
کہ دفعتاً کوئی موقع آجائے اور معقول انتظام جلد اور بروقت نہ ہو سکے تو تکفین و تدفین کا پورا

سامان موجود ہے۔ مسجد میں نہایت ہی ستھرا اور خوبصورت وضوخانہ ایک روشن اور محفوظ برآمدہ میں بنادیا گیا ہے۔ غسل میت اور تجہیز و تکفین کے لئے مسجد ہی سے ملحق لیکن الگ تھلگ ایک جگہ مخصوص کر دی گئی ہے۔ یہ انتظامات جتنے ضروری تھے اتنا ہی ان کی طرف ذہن کم منتقل ہوتا تھا۔ لیکن مولینا کو ان کا پورا احساس تھا اور انہوں نے بعض دشواریوں کا نہایت خاموشی سے مقابلہ کر کے ان سب کا مناسب انتظام کر دیا۔

ایک بار یونیورسٹی میں اس کا بڑا چرچا تھا کہ لڑکے کثرت سے سینما دیکھنے جایا کرتے ہیں۔ بورڈنگ ہاؤس سے باہر شہر کے اندر، رات کے وقت نوجوان طلباء کا ایسے موقع اور مجمع میں موجود ہونا جن کو کسی طرح قابل اطمینان نہیں کہا جاسکتا بُرا ہے اس سے ان کے خصائل و اخلاق پر بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے اور رہ کا تمام یونیورسٹی کے انتظامات میں بھی بڑی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے یہ بہتر ہوگا کہ خود یونیورسٹی کے احاطہ میں سینما ہال کھولنے کی اجازت دینی چاہئے جس پر یونیورسٹی کے مقرر کردہ قیود عائد ہوں۔

دوسرے لوگ یہ کہتے تھے کہ سینما قطعاً مخرب اخلاق ہے، اس کے علاوہ خود یونیورسٹی میں اس کا انتظام ہونے دینا بڑی غلط فہمیوں کا باعث ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی میں "ڈرامیٹک سوسائٹی" پر بھی اعتراضات کئے جارہے تھے کہ یہ چیز اسلامی درسگاہ میں نہ ہونی چاہئے۔

ایک دن اثنائے گفتگو میں میں نے پوچھا، مولانا اس سینما اور ڈرامیٹک سوسائٹی کے بارہ میں مذہبی نقطہ نظر کیا ہے۔ مرحوم نے فرمایا آخر مذہبی نقطہ نظر کے پیچھے کیوں پڑتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ مولوی سوا مذہبی نقطہ نظر کے کسی اور نقطہ نظر کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ اور نہ خود اپنی کوئی رائے رکھتا ہے۔ مجھے یہ تو بتاؤ مذہبی نقطہ نظر

معلوم کرنے کی تم کو اتنی فکر کیوں ہے۔ اس نقطۂ نظر پر عمل کرو گے؟ ہندوستان میں بحالت موجودہ اس پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے؟ آخر اس پر کیوں نہیں راضی ہو جاتے کہ مذہبی نقطۂ نظر کے پیچھے پڑے بغیر بھی معقول پسندی اور حسن تدبیر کو دخل دیا جا سکتا ہے؟

میں نے عرض کیا مولانا بات تو ٹھیک ہے لیکن میں ذرا کند ذہن اور صلح پسند واقع ہوا ہوں۔ معقول پسندی سے بڑی ذمہ داریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان سے کون نپٹے، مذہبی نقطۂ نظر میں یہ آسانی ہے کہ جب جی میں آیا خود جامہ سے باہر ہو گئے اور جب جی چاہا کسی بھلے مانس کی پگڑی اچھال دی۔ مولانا اپنے خاص انداز میں بغیر آواز کی ہنسی خوب خوب ہنسے، پھر اپنے رومال سے چہرہ پونچھنے اور رومال کو ایک طرف رکھتے ہوئے بولے، دیکھو اسلام ایک مجموعہ ہے مخصوص معتقدات اور مکمل اعمال کا۔ اس کے ہر جزو کو کل میں دیکھنا چاہیئے نہ یہ کہ کل کو نظر انداز کر کے جزو پر کٹ مرے۔ جہاں اسلام کا مکمل، مستقل و مؤثر نظام نافذ نہ ہو وہاں ہر مسئلہ یا ہر تحریک کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھنا بیکار اور اس کو بروئے کار لانے کی کوشش مضر ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ انفرادی طور پر اس پر عمل کیا جائے۔ یہ بحث بڑی طویل ہے، کسی مستقل و معقول صحبت میں اس پر مفصل گفتگو ہو گی۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لو کہ جب کسی ناگزیر خرابی یا قباحت کا انسداد ناممکن ہو تو انسداد کی نہیں بلکہ اصلاح کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھ لو کہ ڈرامے میں سوانگ بھرنا، گانا، ناچنا اور مصنوعی حرکات یا باتیں کرنا مردوں بالخصوص مسلمانوں کو زیب نہیں دیتیں۔ ورزش، تفریح، تعلیم، کارکردگی یا اظہار کمال کی اور بہت سی معقول صورتیں بھی تو ہیں۔ آخر ڈرامہ ہی کو سب کچھ کیوں سمجھ لیا جائے۔ اچھے ڈرامے لکھو اور اپنی فکر کی زیبائی و رسائی کا ثبوت دو۔ یہ کیا ضرور ہے کہ اسے کرنے بھی لگو۔ فنون لطیفہ کو معنی بالعموم

پنہاتے جاتے ہیں۔ اسلام نے اس کو گوارا نہیں کیا ہے لیکن فنون لطیفہ کی تعمیر میں مسلمان کسی سے پیچھے نہیں رہے ہیں، اسلام طبیعت کی اُپچ کو نہیں روکتا۔ البتہ اس کی نامعقول تعبیر و تشکیل کا احتساب کرتا ہے۔ مسلمانوں کا جمالیاتی تصور کسی سے کم نہیں۔ انسانی اعمال و افکار کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کرو تو تم کو معلوم ہوگا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بے سروپا نہیں ہے۔

علی گڑھ کے طلباء اور اساتذہ کو علی گڑھ اس لئے عزیز ہے کہ اس میں ہر ذوق کی تسکین و تفریح کا سامان مہیا ملتا ہے۔ جو شخص جس قماش کا ہوگا اس کو اسی قسم کی مکمل سوسائٹی میسر آ جاتی ہے۔ علی گڑھ کی ہر دلعزیزی کا یہی راز ہے۔ ورنہ مقامی اعتبار سے علی گڑھ میں کوئی جاذبیت نہیں ہے۔ دوسرے بڑے شہروں کے برخلاف یہاں نہ اعلیٰ درجہ کی دکانیں ہیں۔ نہ مناظر فطرت نہ تفریح گاہیں۔ یہاں کا کوئی شخص محض تفریح کی خاطر کبھی شہر نہیں جاتا اور نہ کسی کے لئے یونیورسٹی کی حدود سے باہر دل بستگی کا کوئی سامان ہے۔ ہر شخص کو اپنے ہی مخصوص حلقہ میں دلچسپی کا سارا سامان میسر آجاتا ہے۔

پڑھنا لکھنا، کھانا پینا، شوخی شرارت، کھیل کود، رندی و پارسائی، غرض یونیورسٹی کی مکمل زندگی میں جن اسباب یا مواقع کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ سب یہاں ملتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علی گڑھ والے جب کبھی اور جہاں کہیں ایک دوسرے سے ملتے ہیں فوراً بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ اُن کو تصنع یا تکلف کی نہ ضرورت ہوتی ہے اور نہ وہ اس قسم کی طرز عمل پر قادر ہو سکتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ فریقین ایک دوسرے کی اچھائی برائی سے واقف اور علی گڑھ کی روایات سے آشنا ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علی گڑھ والے کبھی اجنبی کی حیثیت سے نہیں مل سکتے۔

مرحوم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اتفاق سے کبھی کسی صحبت میں پہنچ جاتے تو حاضرین میں سے کسی کو یہ محسوس نہ ہوتا کہ کوئی اجنبی مخل صحبت ہوا ہے چہ جائیکہ وہ مولوی ہو جس کے

بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس کی چول کسی خانہ میں ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ یونیورسٹی میں ہر طرح کے لوگ اور ہر طرح کی سوسائٹیاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ مخصوص حلقوں کے مخصوص طور طریقے ہوں گے۔ کوئی پھکڑ ہے کوئی سنجیدہ، کسی کو سیاسی مسئلہ سے دلچسپی ہے تو کسی کو مذہبی باتوں سے تسکین ہوتی ہے۔ زندگی کو کوئی کسی زاویہ سے دیکھتا ہے کوئی کسی زاویہ سے۔ کوئی کچھ ہے اور کوئی کچھ۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ مرحوم یونیورسٹی کے ناظم دینیات تھے جس پر منصب کے اعتبار سے خاص خاص پابندیاں عائد ہوتی تھیں اور انہیں پابندیوں کے اعتبار سے اسکے کردار گفتار متعین ہوتے تھے۔ بایں ہمہ یہ عجیب بات تھی کہ مولانا کی غیر متوقع آمد پر بھی لوگ خوش اور بشاش ہو جاتے تھے گفتگو کی روانی اور تسلسل میں کوئی فرق نہ آتا اور لوگ آرزو کرتے کہ مولانا بھی ان کی گفتگو میں شریک ہوں۔

مرحوم کی سیرت و شخصیت کا کمال یہ تھا کہ کبھی کسی حالت میں نہ اپنے حدود سے خود متجاوز ہوتے تھے۔ مرحوم کو خدا نے ایسا متوازن دل و دماغ دیا تھا اور ان کی شخصیت اتنی دلآویز تھی کہ ان کو اپنے منصب کی آڑ پکڑنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اور نہ انہوں نے اپنے طور طریقوں سے کبھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ ناظم دینیات یا عالم دین تھے۔

ممکن ہے میرے محض اتنے سے بیان سے بعض لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں۔ اس لئے میں اس کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

فرض کیجئے کہ کسی مذہبی یا اخلاقی مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے، مرحوم غالباً کبھی کوئی آیت یا حدیث نہ پڑھیں گے۔ اور نہ آئمہ و اکابر کے اقوال پیش کریں گے۔ وہ بالکل ایک معمولی انسان کی طرح بحث میں حصہ لیں گے اور اپنا نقطۂ نظر اس طور پر پیش کریں گے کہ آپ کو اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی ہمت ہوتی رہے گی اور بحث میں آپ کی دلچسپی بڑھتی جائے گی۔ چنانچہ آپ یہاں تک محسوس کرنے لگیں گے کہ اس سے بہتر کوئی اور موقع اس مسئلہ کے سلجھانے کا نہیں ہے۔

اس قسم کے اکثر مواقع پیش آتے رہتے تھے۔ میں مولانا کی خدمت میں ایک حد تک بیباک تھا اور میری ان باتوں سے مولانا مجھے اور زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ایک بار ایک طویل "علمی مذاکرہ" کے بعد میں نے مولانا سے عرض کیا۔ مولانا بات تو آپ ٹھیک کہتے تھے لیکن یہ ساری باتیں بدیہہ گوئی و بدیہہ آفرینی کے سلسلہ میں تھیں یا اللہ اور رسول کے کلام سے بھی ان کی سند ملتی ہے۔ مولانا اپنی ذہین اور دلنشیں آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے وہی اپنی مخصوص ہنسی ہنسے جس میں آواز بالکل نہیں نکلتی تھی لیکن ہنسی کے زور سے سارا جسم جھٹکے کھانے لگتا تھا، پھر فرمایا تمہارے سوالات بھی خوب ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اللہ رسول کے بارہ میں آج کوئی فیصلہ کن رائے قائم کرنے والے ہو۔

میں نے عرض کیا مولانا فیصلہ کن، نہیں فیصلہ ہی کہیئے اس لئے کہ میں فیصلہ تو اکثر کر لیا کرتا ہوں۔ البتہ اس میں ایک بڑی کمزوری یہ رہ جاتی ہے کہ فیصلہ تو میں کرتا ہوں لیکن کُن اللہ میاں نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ مولانا اس فقرہ سے بہت محظوظ ہوتے پھر فرمایا، میں جو کچھ کہتا تھا اس کی تصدیق "کلام الہٰی" اور "حدیث نبوی" سے ہوتی ہے۔ چنانچہ مرحوم نے آیات قرآنی سنائیں احادیث کا حوالہ دیا۔ غرض ہر بات پورے طور پر منقح کر دی۔

مرحوم کا یہ خاص وطیرہ تھا کہ جب کوئی مسئلہ چھڑتا تو جب تک ان سے خاص طور پر رجوع نہ کیا جاتا۔ وہ خواہ مخواہ مباحثہ میں شریک نہ ہوتے۔ برخلاف بعض لوگوں کے جن کی عام عادت یہ ہے۔ کہ ایسے مواقع پر وہ جو کچھ جانتے ہیں اُسے بے تکان بتانا شروع کر دیں گے۔ اور یہ کوشش کریں گے کہ لوگ ان کے فکرو نظر کے قائل ہو جائیں۔ چنانچہ اس وقت تک نہ چپ ہوں گے جب تک ان کا مبلغ علم ختم نہ ہو جائے یا لوگ حفاظت خود اختیاری میں بھاگ نہ کھڑے ہوں۔

لیکن جب کوئی بات مولانا سے رجوع کی جاتی تو وہ نہایت خوشی، نہایت اطمینان اور نہایت اعتماد کے ساتھ گفتگو کرنے اور علوم و احکام دینیہ کے تمام نکات بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتے۔ بعض مسائل ایسے ہوتے جن پر ائمہ کو اختلاف ہوتا اُسے بھی بڑی صفائی و صداقت کے ساتھ واضح کر دیتے، مرحوم کو علوم دینیہ پر بڑا عبور تھا۔ کتابوں کے حوالے اور اکابر کے اقوال بڑی دیانت اور بڑے وثوق سے پیش کرتے۔ اس وقت مجھے یہ حیرت ہوتی کہ یہی مولانا جواب تک ہم سب کے ساتھ خوش گپیّ میں مصروف تھے۔ ایک متبحر عالم کے فرائض کس خوبی سے انجام دے رہے ہیں۔

مرحوم کو عام طور پر گفتگو کرتے یا رہتے سہتے دیکھ کر کسی کو بمشکل یہ گمان ہوتا کہ مرحوم کا علم کتنا حاضر کتنا وسیع اور کتنا گہرا ہے۔ ہم سب بھی آخر لکھنے پڑھنے ہی کا شغل رکھتے ہیں۔ ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو علوم جدیدہ سے پورے طور پر آشنا ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو دونوں علوم پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ علوم دینیہ سے پورے طور پر آگاہ نہ ہونے کے باوجود ہم اس امر کا تو پتہ لگا ہی سکتے ہیں۔ کہ کس بحث میں کس کا کون سا پہلو کمزور ہے۔

میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ مولانا مذہبی نقطۂ نظر اس انداز سے پیش کر رہے ہیں گویا دو خالص مذہبی نقطۂ نظر نہ تھا بلکہ اُن کے مدِنظر ہمارا ہی اصول بحث تھا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے مولانا ہمیں لوگوں میں ایک تھے اور ہمارے ہی علوم سے بحث کر رہے ہیں۔ وہ بحث میں ایسی مثالیں پیش کرتے جو موجودہ دور میں مسائل نہیں بلکہ مسلمہ فیصلے تھے جن پر تجربات جدیدہ کی مہر استناد لگی ہوئی تھی۔

علوم اسلامیہ میں جو تجربہ مرحوم کو تھا۔ اُس سے قطع نظر دیگر علوم و فنون سے بھی مولانا کو بڑی دلچسپی تھی۔ مرحوم کو ریاضی میں بڑا درک تھا۔ میں نے ریاضیات جدیدہ کے بعض کاملین کو یہ کہتے سُنا کہ مولانا کو "ریاضی" اور "اقلیدس" پر بڑا عبور تھا۔ عربی میں ریاضی کا جو سرمایہ ہے اس کا

معقول حصّہ مولانا کی نظر سے گزر چکا تھا۔ فلکیات سے مرحوم کو خاص لگاؤ تھا۔ رات میں چبوترے پر لیٹے ہوئے جن جن ستاروں کے عجیب و غریب نام عربی فارسی میں آتے ہیں۔ ان سب کو دکھاتے بتاتے۔ ایک دفعہ سمت قبلہ کی بحث آگئی، مولانا نے قطب تارہ کا مقام اور مختلف متعلقہ ستاروں کو ایک ایک کرکے بتایا۔ عہد پیشین کے ماہرین فلکیات نے اپنے حساب کی رو سے جن ستاروں کا جو محل یا مقام بتایا تھا۔ اور امتداد زمانہ سے ان میں اب جو تفاوت پیدا ہوگیا ہے ان سب کو بڑے لطف و وضاحت سے بیان کیا۔ اسی سلسلہ میں جنتریوں کی مفصل تاریخ اور ان کے اصول ترتیب و تدوین بھی سنائے۔

ایک دن کہنے لگے اور کیوں جی رشید غالب کے کلام میں "بنات النعش" کا نام آیا ہے۔ ان کو دیکھا بھی ہے یا نہیں؟ میں نے کہا جی نہیں۔ فرمایا دیکھو گے۔ میں نے کہا اب کیا دیکھوں۔ ان کے دیکھنے کا لطف تو غالب ہی کے زمانہ میں تھا۔ یونیورسٹی کے عہد میں دیکھ کر کیا کروں گا، ہوں گی بھی تو یونیفارم ہی میں ہوں گی۔ ورنہ آپ دعوت دید کیوں دیتے! مولانا بہت لطف اندوز ہوئے۔

ایک زمانہ میں میرا اردو کا کام ہلکا تھا۔ صرف چند جماعتوں کو اردو کی معمولی کتابیں پڑھانی ہوتیں۔ اس لئے بی اے اور ایم اے کا فارسی کا کام بھی سپرد کر دیا گیا تھا۔ ایم اے کا تصوف کا پرچہ میرے سپرد تھا۔ اس میں دو کتابیں لوائح جامی اور محمود شبستری کی گلشن راز (بالخصوص لاہجی کی شرح گلشن راز) ایسی تھیں جن میں بعض اوقات مجھے اسلامی فلسفہ، منطق، تصوف و معقولات کے مسائل مہمہ سے سابقہ پڑتا تھا۔ میں مرحوم سے رجوع کرتا تو وہ ان کی وضاحت اس خوبی اور اعتماد کے ساتھ کرتے کہ جی خوش ہو جاتا اور ایک خاص طرح کا ذہنی انشراح ہوتا۔ اس کے علاوہ اکثر صحبتوں میں نظیری اور غالب کے کلام پر محاکمہ کیا جاتا۔ اس وقت

معلوم ہوتا کہ مولانا کا فارسی شاعری اور فارسی ادب کا ذوق کتنا پاکیزہ اور سلجھا ہوا تھا مرحوم کے سامنے اردو کا کوئی اچھا شعر پڑھا جاتا۔ تو اکثر وہ اس سے ملتے جلتے مضمون کا فارسی یا عربی شعر سنا دیتے۔

مرحوم کو صرف عربی فارسی کی ادبیات سے ذوق نہ تھا بلکہ اردو اساتذہ کے بھی ان گنت اشعار یاد تھے اشعار مزے لے لے کر پڑھتے تھے۔ محسن کاکوروی کی تقریباً ہر مشہور نظم یاد تھی۔ جس کو ایک خاص ترنم سے پڑھتے، اکثر کہا کرتے تھے کہ مذہبی تعقدات کو لکھنوی شاعری میں جس طرح محسن نے سمویا اور نباہا ہے وہ کسی اور کے بس کا نہ تھا۔

اسلامی قانون وراثت پر بڑی اچھی اور گہری نظر تھی، قانون کے اکثر طلباء فرائض کی تقسیم سمجھنے کے لئے مولانا کے پاس آیا کرتے تھے اور طلباء کو پورے طور پر مطمئن کر دیتے تھے۔

عرصہ کی بات ہے یونیورسٹی میں ایک بنوٹ ماسٹر رکھے گئے تھے۔ بڑے تعریف اور محبت کرنے والے انسان تھے اور اس فن کے امام وقت تھے۔ مولانا سلیمان اشرف صاحب مرحوم ان پر بہت قربان تھے اور اپنے دوستوں کو ترغیب دیتے تھے کہ وہ بھی بنوٹ سیکھیں۔ اکثر اصحاب نے سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک صاحب جن کی نظر سے یہ سطور یقیناً گزریں گی۔ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک دن نماز فجر کے بعد مرحوم گھومتے گھامتے ان کے گھر جا پہنچے۔ باتوں باتوں میں پوچھنے لگے اور کہیوں صاحب کچھ بنوٹ کی بھی مشق جاری ہے۔ انہوں نے فرمایا جی ہاں دو چار ہاتھ سیکھے تھے لیکن ادھر ناغہ ہوتا رہا۔ اس لئے مشق و صفائی کی نوبت نہ آئی اور پیچ و پلیترے بھی کچھ بھولنے لگا ہوں۔

مرحوم نے فرمایا اچھا مجھے بتائیے کیا سیکھا تھا چنانچہ انہوں نے دو چار ہاتھ دکھائے۔ مرحوم نے فرمایا اچھا آئیے میں مشق کرا دوں . . . . . . صاحب کا بیان ہے کہ مولانا مرحوم

نے اس سلسلہ میں جو ڈائیں بنائے اور جس صفائی سے لکڑی چلائی اور اس کی بندش کی وجہ اعتبار سے استادانہ تھی اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ نہٹ کے فن میں مرحوم طاق تھے۔

مرحوم کو مردانہ کھیل بہت پسند تھے۔ شکار کے بڑے شائق تھے، گولی بھی خاصی چلا لیتے تھے۔ شکار پارٹیوں میں اکثر شریک ہوتے اور شکار میں "چلاتی" تو وہ ایسی کر لیتے تھے۔ کہ نوجوان دنگ رہ جاتے تھے۔ غلیل چلانے کی بڑی اچھی مشق تھی، اس فن کے رموز سے خوب واقف تھے۔ غلیل دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ کہاں کی بنی ہوتی ہے، کس زمانہ کی ہے اور کس کوٹھی کا بانس ہے۔ بانس کی چھڑی بہت پسند کرتے۔ بانس پہچاننے کا عجیب ملکہ تھا۔ کسی کے ہاتھ میں اس قسم کی چھڑی یا ڈنڈا پا لیتے تو اپنے ہاتھ میں لے کر اسے بڑے شوق سے دیکھتے بھالتے اور بتاتے کہ بانس کی چھڑی کس طرح بنائی سُدھاری جاتی ہے۔ اس کی گرہیں کیسی بنائی جاتی ہیں۔ کیسے اس پر رنگ پیدا کیا جاتا ہے۔ کس طرح پختہ کرتے ہیں اور کیا رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ایک بار ابھرے ہوئے حروف (ریلیف) کی چھپائی پر گفتگو ہو رہی تھی۔ مرحوم نے فرمایا کہ ان کی طالب علمی کے زمانہ میں اس قسم کی چیز رائج تھی۔ اس وقت مشین تو تھی نہیں لوگ ناخن سے اس طرح کی چیز بنا لیتے تھے اور یہ بھی ایک طرح کا فن تصور کیا جاتا تھا۔ پھر فرمایا اب مشق تو رہی نہیں لیکن کوشش کرتا ہوں، شاید کچھ ہو جائے۔ اس کے بعد ایک معمولی سے کاغذ کے پرزہ کو چٹکیوں کی گرفت میں لے کر تلے اوپر کچھ اس طرح ناخن سے کچوکے دیئے کہ تھوڑی ہی دیر میں چند حروف ابھر آئے۔ جو بالکل ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی ڈائی سے ابھرے ہوئے حروف چھاپے گئے ہیں۔ فرمایا جب مشق تھی تو پوری عبارت لکھ لیا کرتا تھا۔

ایک دن بھی ملاقات نہ ہوتی تو پوچھتے کہ کہاں تھے، کیسے ہو۔ مسکراکر محبت اور دوستی

کے لہجہ میں شفقت کے انداز سے۔ دوستوں کے بارہ میں لطف و مرحمت کا کوئی جملہ کہتے۔ کوئی ایسی بات ضرور کہتے جس سے مجھے اپنی فرزانگی یا شرافت کا احساس ہوتا۔ زمانہ و زندگی کی عارضی یا مسلسل مکروہات یا سیرت کے بعض داغ و دھبے دُھل جاتے۔ یا مدھم پڑ جاتے اور محسوس ہونے لگتا کہ شرافت و اولوالعزمی، خلق و مرحمت دُنیا کی بڑی چیزیں اور زندگی کی بڑی آسودگیاں ہیں۔

میرا پرانا مکان مرحوم کے مکان سے بالکل قریب تھا۔ ممتاز ہاؤس کے پورب میں ایک بڑا میدان ہے۔ اس میں ہو کر مولانا کالج اور مسجد جاتے۔ مئی جون کی علی گڑھ کی گرمی میں جب آگ برستی ہوتی اور گرد و غبار سے فضا تیرہ و تار ہوتی مولانا ظہر کی نماز پڑھانے اس میدان سے گزرتے۔ اسی پابندی وقت سے جیسے گھڑی چلتی ہے۔ بالکل جیسے کوئی مجاہد میدان جنگ میں جاتا ہے، نہایت ہی ادنےٰ قسم کی کھدر کی عبا۔ کھدر کی صدری۔ کھدر ہی کا لمبا کرتہ اور ٹخنوں سے اونچا پاجامہ۔ ایک لمبا سا رومال کاندھے پر۔ موسم کی شدت ہوتی تو اسی سے گلا اور کان چھپاتے ہوتے۔ سر پر عمامہ۔ پاؤں میں سُرخ رنگ کا ڈھیلا ڈھالا پنجابی وضع کا جوتہ۔ مولانا کی عمر غالباً ۵۵ سال کی ہوگی۔ جسم و جسامت کے اعتبار سے ممتاز نہ تھے، بال کافی سپید ہو چکے تھے لیکن طبیعت ایسی مردانہ پائی تھی کہ ان کے کسی فعل سے کبھی یہ نہ محسوس ہوتا کہ مولانا کی رفتار گفتار یا کردار میں تھکن کا کوئی شائبہ بھی تھا۔ منزلیں مارتے پیدل آتے ہیں۔ اور اپنے لمبے رومال سے پاؤں کی گرد طانت و اعتماد سے جھاڑ کر کرسی مونڈھے یا چارپائی پر بیٹھ گئے۔ نہ زبان سے کوئی ایسا فقرہ کہیں گے اور نہ تیور سے اس کا پتہ لگے گا کہ تکان غالب ہے۔ اسی طور پر جب اُٹھ کھڑے ہونے تو نہ بوڑھوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھ کر۔ کسل مند ہو کر۔ یا آہ کر کے کھڑے ہوتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا جیسے تازہ دم اُٹھ رہے ہیں۔

ان کا ڈھیلا ڈھالا کھدر کا لباس، سپاہیانہ عمامہ ہاتھ میں ڈنڈا۔ قدم لمبے اور ہموار جیسے کوئی قواعد پریڈ کر رہا ہو۔ کوئی واقعہ ہو کسی حال میں ہوں۔ یہ ناممکن تھا کہ قدم کی لمبائی میں ایک انچ کی کمی بیشی ہو جاتے یا رفتار میں جھول آجائے۔ مسجد جا رہے ہوں، کلاس پڑھا کر نکلے ہوں دوستوں کے ساتھ ہوں یا جنازہ کے ہمراہ اس مستعدی سے بڑھتے تھے جیسے ہر بات میں ہر شخص سے سبقت کرنا چاہتے ہیں۔ خوشی ہو یا غمی لب و لہجہ کے مردانہ پن میں فرق نہیں آنے پاتا تھا۔ کوئی محفل ہو کسی شخص کا سامنا ہو مرحوم کہیں جھجکتے نہیں تھے۔ بڑے سے بڑا آدمی ہو ہمیشہ گفتگو اس طور پر کرتے جیسے کسی اپنے برابر کے آدمی سے مل رہے ہیں۔ لہجہ میں استواری بات میں صفائی، چہرہ پر مردانگی، انداز میں شگفتہ سنجیدگی آتے تو لوگ خوش ہو جاتے، جاتے تو بڑی خوش آیند فضا چھوڑ جاتے۔

میرے مکان کا صدر دروازہ آنے جاتے پہلو پر پڑتا جو بالعموم کھلا رہتا تھا۔ مرحوم کا معمول تھا کہ کسی نہ کسی وقت ضرور آجاتے۔ کوئی مہمان ہوتا تو اس سے تھوڑی دیر تک گفتگو میں آگیا تو خیر ورنہ اطلاع کبھی نہ کراتی۔ اندر بچے سن پاتے کہ مولانا تشریف لاتے ہیں تو بھاگ کر باہر آتے۔ مولانا بھی اسی انتظار میں ہوتے، دور ہی سے کہتے بھاگ آ بھاگ آ اور عبا میں چھپ جا میں آتا۔ تو پوچھتے بتاؤ منی کہاں گئی۔ میں کہتا معلوم نہیں البتہ آپ کے عبا کے نیچے دو پاؤں نظر آرہے ہیں۔ کہتے ارے وہ تو چلی گئی اپنے پاؤں چھوڑ گئی۔ یہ کہتے اور اس کا پاؤں عبا ہی سے ڈھانکتے جاتے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میدان سے گزر رہے ہیں، بچوں نے دیکھ پایا۔ سب کے سب شور مچاتے پہنچ جاتے اور کہتے عبا میں چھپاتے، مولانا کتنے ہی ضروری کام سے جاتے ہوں فوراً ٹھہر جاتے۔ ہر چہار طرف طلباء اور لوگ آتے جاتے ہوتے۔ مولانا ان بچوں کی فرمائش کو پورا

کرتے اور آیندہ روندگان سے پوچھتے بتاؤ فلاں بچہ کہاں ہے۔ لوگ بھی ٹھہر جاتے اور مولانا کی اس تفریح کا تماشا دیکھتے۔ کبھی بچے بہت اور عبا میں جگہ نہ ملتی تو کسی کو اپنا ڈنڈا دے دیتے۔ کہ اسے گھوڑا بنا کر دوڑا۔ ورنہ کاندھے سے رومال اتار کر اس پر ڈال دیتے اور اسے بھی چھپا لیتے۔

جاڑے میں کھدر کی پوری آستین کا شلوکا پہنتے اور نہایت معمولی داموں کا کمل نما کپڑا عبا کی شکل میں استعمال کرتے۔ صرف گرمیوں میں اکثر لمبے کرتے پر ایک صدری استعمال کرتے۔ لیکن ایسا لباس صرف اپنے گھر پر یا بے تکلف دوستوں کے ہاں جاتے وقت استعمال کرتے۔ ڈنڈا اور عمامہ البتہ کبھی نہیں ترک کیا۔ ڈنڈے کے سہارے سے کبھی نہیں چلے بلکہ اسے اس انداز سے لے کر چلتے تھے گویا سہارا مقصود نہ تھا۔ بلکہ اس سے اظہار اعتماد و افتخار تھا۔

چندہ دینے، سائل کی امداد کرنے اور اچھی چیزیں خریدنے کا بڑا شوق تھا۔ روپے پیسے کی طرف سے اطمینان نہ تھا لیکن موقع آن پڑتا تھا تو اپنی بساط سے زیادہ صرف کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے کسی قدر آزردہ ہو کر مرحوم سے کہا کہ آخر آپ اس قدر شاہ خرچی پر کیوں اُتر آتے ہیں۔ مولانا مسکرائے، فرمانے لگے، بھائی دیکھو تو کوئی مانگتا ہے تبھی تو دیتا ہوں یوں تو پھینکتا نہیں پھرتا۔ میں نے عرض کیا جب آپ کی اس کمزوری سے لوگ واقف ہو جاتے ہیں تبھی نہ مانگنے لگتے ہیں، کہنے لگے اچھا سنو ایک عرب کا قصہ تم کو سناؤں۔

ایک عرب کی ملاقات اپنے جانی دشمن سے ہوگئی اعرب کے پاس نہایت اچھی تلوار تھی۔ دشمن نے تلوار ہی کی فرمائش کردی۔ عرب نے بغیر کسی تکلف کے تلوار حوالہ کردی۔ بات آئی گئی ہوتی، کسی دوست نے عرب سے کہا کہ یہ حماقت کیوں کی۔ تم تو نہتے ہوگئے تھے اگر دشمن نے حملہ کر دیا ہوتا تو کیا کرتے اس نے کہا ٹھیک کہتے ہو اتنی سی بات میں بھی سمجھتا تھا لیکن،،

اس کو کیا کروں جب وہ مانگ بیٹھا تو میں کیسے نہ دیتا۔ غور تو کرو وہ مانگ بیٹھا!!

میں نے بہت کم لوگوں کو مولانا جیسا کنبہ پرور اور مہمان نواز پایا۔ ان کا گھر ہر طرح کے مہمانوں عزیزوں اور نوواردوں سے بھرا رہتا۔ میں نے آج تک نہ دیکھا کہ مولانا کے ہاں مہمان اجنبی نہ موجود ہوں۔ جو کھاتے وہ سب کو کھلاتے پلاتے، کھانا، فواکہات، غرض اس قسم کی تمام باتیں سب کے ساتھ باہر مردانہ میں ہوتیں۔ یہ مرحوم کے خاندانی روایات میں سے تھا۔ وطن میں بھی مولینا کا گھر ہر طرح کے لوگوں کا ماویٰ وملجا تھا۔ جس کا جی چاہے چلا آئے۔ گھر والوں کی طرح رہے سہے، کوئی نہ پوچھے گا کہ آپ کون ہیں۔ کیسے آئے کب تک رہیئے گا۔ اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو خاندان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس سے کوئی تکلف نہ برتا جائے گا۔ اس کا جی چاہے تو وہ ہر صحبت میں ہر گفتگو میں بلاتکلف شریک ہو۔ بالکل یہی نقشہ علی گڑھ میں پندرہ سال تک رہا۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ علی گڑھ کے ایک بڑے صاحب اقتدار بزرگ مولانا کے ہاں اتفاقاً آگئے، سہ پہر کی چائے ہو رہی تھی۔ مجمع دیکھ کر وہ جھجکے اور دریافت کیا کہ کس کا "ایٹ ہوم" ہے مولانا بھی مجمع ہی میں ملے جلے ایک طرف بیٹھے تھے بولے آجایئے آجایئے یہاں ہر شخص ایٹ ہوم ہے۔ ان بزرگ کو اب تک اس پر تعجب ہے کہ ایک مولوی جس کی آمدنی یا تنخواہ بالکل معمولی تھی اتنا شاہ خرچ کیسے ہو سکتا ہے۔

مرحوم کو چائے کا بڑا شوق تھا۔ بڑے تکلف اور تیاری سے چائے پیتے تھے۔ جمعہ کی نماز کے بعد مسجد سے ملحق اپنے دفتر کے کمرہ میں کچھ دیر قیام فرماتے، مرحوم کے احباب اور معتقدین بھی آ جاتے چائے کا دور ہوتا، سب لوگ لطف واطمینان کے ساتھ گفتگو کرتے اور مرحوم کی سنجیدہ پر خلوص اور شگفتہ باتوں کے مزے لیتے۔ یہ ہمیشہ کا معمول تھا۔ اس حلقہ میں بیٹھنے والے ہر بات

کا فخر و مسرت کے ساتھ اظہار کرتے کہ نماز جمعہ کے بعد مولانا کے ہاں بیٹھے جاتے ہیں اور گفتگو کی۔

رمضان شریف میں جب مرحوم مسجد میں معتکف ہوتے تو بھی یہ ایک خاص بات سمجھی جاتی۔ کہ مولانا سے اعتکاف میں ملاقات ہوئی۔ ہم کلامی و ہم نشینی کا یہ وقت اتنا اچھا گزرتا تھا کہ لوگ اس کو دن کا بہت اچھا دافعہ خیال کرتے تھے۔ مسجد کے شمالی سرے کی آخری محراب میں مولانا معتکف ہوتے تھے اور چونکہ اس زمانہ میں کہیں ملنے ملانے جا نہیں سکتے تھے اس لئے ہر شخص کو اپنے اپنے معمولات میں خلا سا محسوس ہوتا اس لئے بالالتزام مولینا سے ملنے مسجد میں جاتا۔ ہر شخص سے اس کے مذاق کی گفتگو کرتے، عطر پیش کرتے، دو چار باتیں ہنسی کی بھی کرتے۔ اور ایسا ظاہر کرتے کہ نہ روزہ کی کوئی تکلیف ہے اور نہ اعتکاف کی پابندی گراں ہے بلکہ ان دونوں کو وہ ایک ایسا رنگ دے دیتے تھے کہ یہی چیزیں خوش آیند معلوم ہونے لگتیں اور لوگ مولانا کے ہاں جانا اتنا ہی ضروری سمجھتے تھے جیسے سیر و تفریح کے لئے جانا، یہ مولانا کی سیرت کا عجیب پہلو تھا کہ ان کے "معمولات" دوسروں کے لئے "ادارہ" بن جاتے تھے۔ نماز جمعہ کے بعد مولانا کا اپنے دفتر میں ٹھہرنا اور چائے پینا یا اعتکاف میں بیٹھنا مولانا کے معمولات میں سے تھا۔ لیکن دوسروں کے لئے یہی صحبت ایک معاشرتی ادارہ کی صورت اختیار کر لیتی تھی اور جب تک یہ لوگ اس حلقہ میں بیٹھ نہ لیتے تھے ان کے روزانہ پروگرام کی تکمیل نہیں ہوتی تھی۔ یہی وہ مقام ہے جس کے بارہ میں اصغر نے کہا ہے۔

رندِ بزظرف اٹھا لیں نہ ہی ساغر بن جاتے ہیں
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں نہ ہی میخانہ بنے

موسم سے مرحوم کبھی متاثر نہ ہوتے۔ پنج وقتہ نماز مسجد میں پڑھی اور پڑھائی، جاڑوں میں فجر کی نماز اول وقت مسجد میں جا کر پڑھانی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مغرب کی نماز پڑھ کر

دونوں میں آپ بیٹھتے اور عشاء کے وقت رخصت ہو جاتے۔ اکثر ہم لوگ مولانا سے عرض کرتے مولانا کہاں جائیے گا، آج تو منشی جی ہی کو امامت کا افتخار حاصل کرنے دیجئے۔ کہتے نہیں بھائی منشی جی کے پیچھے نماز پڑھنے سے لڑکے گھبراتے ہیں۔ طلباء کا سابقہ ایسے سے نہ ہونا چاہیئے۔ تم لوگوں کا جی چاہے تو بیٹھے رہو میں نماز کے بعد آجاؤں گا۔ اکثر منشی جی کو نماز پڑھانے کا موقع دے دیتے۔ یہ محض ہم لوگوں کا دل رکھ لینے کے لئے ہوتا۔

اکثر ایسا بھی اتفاق ہوا کہ مولانا کسل محسوس کر رہے ہیں، یا بڑے لطف کی گفتگو ہو رہی ہے۔ یا کسی کام میں بڑے انہماک سے مشغول ہیں کہ نماز کا وقت آگیا۔ مولانا چاق ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور نماز پڑھانے چل دیں گے۔ اس طور پر جیسے ان میں نئے سرے سے توانائی پیدا ہو گئی یا کوئی بڑا خوش گوار فرض یاد آگیا۔ لطف یہ کہ ایسے مواقع پر وہ کسی کو مضطرب نہ ڈالتے اور یہ محسوس نہ ہونے دیتے تھے کہ وہ تو نماز پڑھانے جا رہے ہیں اور لوگ خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ جیسا کہ بعضوں کا رویہ ہوتا ہے۔ یعنی کوئی شرعی فرض بھی بجا لائیں گے تو اس طور پر کہ دوسروں کو نہ جاتے فرار ملے نہ جائے عافیت۔

ایسے لوگ ہم میں آپ میں اکثر ملیں گے جو فریضہ مذہبی ادا کرنے کے لئے اس طور پر تیار ہوتے ہیں گویا ان کا عبادت الٰہی کے لئے آمادہ ہونا ہی دوسروں پر عذاب الٰہی نازل ہونے کا موجب ہو گا۔ عبادت الٰہی یہ ضرور کرتے ہیں لیکن ان کی دلی آرزو یہ ہوتی ہے کہ خدا ان کی عبادت کو اپنی تحمید و تسبیح نہ سمجھے بلکہ غافلوں کے خلاف مقدس جنگ سمجھ لے اور اسی اعتبار سے ان کو جزا اور دوسروں کو سزا دے۔ یہ جنت میں "سرکاری گواہ" بن کر جانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

آہ، مولانا مرحوم ایسے نہ تھے۔ انہوں نے مذہب کو ڈرانے دھمکانے یا فخر و پندار کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ ہم لوگ کبھی کبھی دینی یا دنیوی امور میں خوش طبعی یا سہل انگاری کو دخل دے

جاتے تو مولانا ہنس کر بڑے لطف و رحمت سے فرماتے "ارے بس کر بھائی بس کر، بڑا شریر ہے اس سے جان بچانی مشکل ہے" لیکن ہم جو کچھ کرتے وہ اس بنا پر ہوتا کہ مولانا ہم کو اور ہم مولانا کو عزیز تھے۔ وہ جانتے تھے کہ معاملہ کیا ہے۔ مولانا ہم کو ناظم دینیات کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک اچھے انسان کی حیثیت سے عزیز تھے۔ اور مولانا بھی ہم لوگوں کو انسان ہی سمجھتے تھے۔ اور یہی وہ رشتہ تھا جس نے ہم دونوں کو ایک جان دو قالب بنا رکھا تھا۔ ایک دن باتوں باتوں میں کہہ گئے۔ میاں دوسرے مذاہب پر نہ رہنے ہیں۔ اسلام اخلاق و اعمال پر نظر رکھتا ہے۔ مسلمان کا ہر فعل گناہ ہے یا ثواب، اس کے بعد جاؤ، جو جی چاہے کرو۔

یونیورسٹی کے قانون کے ماتحت نماز نہ ادا کرنے پر جرمانہ ہوتا ہے۔ جن طلباء پر جرمانہ کی سزا عائد کی جاتی وہ معاف کرانے کے لئے مولانا کے پاس آتے۔ ان سے مولانا بڑے لطف و شفقت سے پیش آتے۔ نہ جھڑکتے نہ گھرکتے اور نہ ان کو شرمندہ کرتے۔ باتوں باتوں میں نماز نہ پڑھنے کے وجوہ دریافت کرتے پھر کہتے میاں تمہارا یہ زمانہ بے فکری اور آزادی کا بھی ہے اور پابندی و ریاضت کا بھی بڑے ہو گئے تو اس زمانہ کی فراغتوں یا غفلتوں کو یاد کر کے مسرور یا ملول ہو گے۔ اس لئے موجودہ زمانہ کو غفلت میں مت گنواؤ۔ اس وقت دکھ درد میں اپنے ماں باپ یا سرپرستوں سے تقویت حاصل کرتے ہو، جب بڑے ہو گے تو ماں باپ یا سرپرست کوئی نہ ہوگا اُس وقت بھی سہارے کی ضرورت ہوگی۔ وہ ایسا وقت ہوگا جب اُس سہولت سے تم کو سہارا نہ ملے گا۔ جو اس وقت میسر ہے۔ اس لئے اسی وقت سے خدا کا سہارا ڈھونڈو تاکہ موقع پر پچھتاوا نہ ہو۔ جاؤ جرمانہ معاف کیا جاتا ہے۔

کلکٹر کا سرطان موت کا بہانہ بنا۔ ڈیڑھ دو سال سب کچھ کیا گیا لیکن ہوا وہی جس کا یقین تھا جو ٹالنے والے کے حدود سے باہر ہو چکا تھا۔ کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی گئی۔

ڈاکٹر، حکیم، وید، سیانے، دوا نے سبھی سے رجوع کیا گیا۔ مرض میں تھوڑا بہت تغیر ہو جاتا تھا۔
لیکن قابلِ اطمینان صورت کبھی نہ ہوئی۔ لاعلاج مرض اور محبوب مریض کی مسلسل تیمارداری،
دوا دوش، زیرباری اور ہر دم کا یہ احساس کہ اندوہناک انجام قریب تر آتا جا رہا ہے۔ کیسا
مستقل ذہنی کرب ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا اس سے سابقہ ہو۔
اور خدا نہ کرے کسی کو ایسا سابقہ ہو۔

لیکن مرحوم تھے کہ اپنی جگہ پر تنہا کھڑے تھے جیسے کوئی مجاہد تنہا دشمنوں کے سامنے ہو۔
تلوار ٹوٹ چکی ہو، زخموں سے جسم پاش پاش ہو، پیچھے دیوار ہو، سورج ڈوبنے والا ہو اور موت
کے پرانے دم بہ دم بڑھنے والی نوبہ نو ادر نہر بہ تہہ تاریکی میں چیخ چیخ اور جھپٹ جھپٹ کر ایک
دوسرے کا راستہ کاٹ رہے ہوں۔ دل میں خدا جانے جذبات کے کیسے کیسے مدّوجزر ابھرتے
مٹتے رہے ہوں گے۔ لیکن لبوں پر شگفتگی، آواز میں امید و استقامت اور آنکھوں میں روشنی
جھلکتی رہی۔ ہراس و ناامیدی کا کوئی اثر نہیں۔ تیمارداروں کو تھپکتے، ملنے والوں کو تسکین
دیتے۔ نہ کراہتے نہ بیزار ہوتے، نہ اپنی تکلیف کا خود اظہار کیا نہ دوسروں سے اس کا تذکرہ کیا۔
پگھل گئے لیکن ہلے نہیں۔

رخسارہ میں سوراخ ہو گیا تھا۔ دانتوں سے کچھ چبا نہیں سکتے تھے، صرف رقیق غذا پر مدار
تھا وہ بھی کس مصیبت سے فرو کی جاتی تھی۔ ایک دن میں موجود تھا، دودھ پینے کی کوشش کر
رہے تھے جو بار بار رخسارہ کے سوراخ سے نکل جاتا تھا۔ کبھی ناک میں چڑھ جاتا، کبھی چھینک یا
کھانسی آنے لگتی تھی۔ کپڑا تر بتر ہو رہا تھا۔ میری طبیعت بھر آئی۔ لیکن مرحوم کے منہ سے کوئی کلمہ
مایوسی یا بیزاری کا نہ نکلا اور نہ تھکنے ہارنے کا اظہار کیا۔ مشکل سے دو چار گھونٹ دودھ کے فرو
ہوئے ہوں گے۔ لیکن مرحوم نے پیالہ اس انداز سے واپس کیا جیسے خوب آسودہ ہو چکے ہیں۔ یہ

صرف بیمار داروں کی دل دہی کے لئے تھا۔ ہاں یاد آیا اتنا ضرور فرمایا "یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے"۔
گزشتہ عید میں اس قابل نہیں رہے تھے کہ مسجد جاسکتے۔ چنانچہ مردانہ میں چارپائی پر دھوپ
میں لیٹے سامنے تین طرف کرسی اور مونڈھے دور دور تک بچھا دئے گئے۔ ملنے والوں کا تانتا بندھا
ہوا تھا۔ جو آتا مولانا کی تکلیف اور معذوری کا خیال کر کے سلام کر کے دور ہی بیٹھ جانا چاہتا۔ مولانا
اُسے اپنے پاس بلاتے، مصافحہ کے لئے خود ہاتھ بڑھاتے، ان کی گرفت میں اب بھی توانائی تھی۔
پاس سے عطر اٹھا کر دیتے۔ اس وقت تک گفتگو کر لیتے تھے۔ ہر آنے والے کا خیر مقدم آنکھوں کی
پُر معنی و پُر مسرت جنبش سے کرتے۔ لطف کے بھی دو چار کلمے کہتے۔ گھر سے کوئی بچہ آنکلتا تو اُسے
اپنے پاس بلاتے، اس کی آرائش و زیبائش کی خاص انداز سے داد دیتے۔ خوش دلی اور خوش خلقی
کا اظہار کرتے اور اس کو کسی طرح یہ محسوس نہ ہونے دیتے کہ وہ خود کس اذیت میں مبتلا ہیں۔
مرحوم کا معمول تھا کہ عید و بقر عید کی نماز شروع ہونے سے ذرا پہلے جگہ جگہ کھڑے ہو کر
تکبیروں کی تعداد اور قیام و قعدہ کے طریق بتاتے تھے۔ ان کا ایک فقرہ اب بھی یاد آتا ہے۔
"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بدول ہاتھ باندھے رکوع میں چلے جاتے"۔ ہر شخص سے معانقہ کرتے
ہزاروں آدمیوں سے گلے ملنا اور خوش دلی کا دامن نہ چھوڑنا بڑا مشکل کام ہے مسکرا کر
آزادی اور شفقت سے گلے ملتے، ملنے میں کسی کو کبھی یہ محسوس نہ ہوتا کہ کسی سن رسیدہ، سنجیدہ،
متقشف، یا متبحر عالم دین یا صرف مولوی سے مل رہا ہے۔ بلکہ ہر شخص یہ سمجھ کر ملتا اور ملنے
کے بعد محسوس کرتا کہ وہ ایک اچھے آدمی اور مخلص و خوش باش دوست سے مل رہا ہے۔
یا مل چکا ہے۔ گزشتہ ہی عید کا موقع تھا، حاضرین میں سے کسی صاحب نے کہا، مولانا
آج عید میں آپ کو نہ دیکھ کر طبیعت بہت اداس ہوتی۔ مسکرا کر فرمایا، انشاء اللہ
آئندہ عید میں اس کا موقع ملے گا۔ اس حالت میں بہت کم لوگ اس طرح کا فقرہ

بے ساختگی سے کہہ سکتے ہیں۔

مولانا کے قویٰ اتنے اچھے اور ان کا مزاج طبعی اتنا صحیح کہ مرض اپنے شدائد کے آخری حدود تک پہنچ گیا لیکن مرحوم کو عوارض متعلقہ میں سے کسی کا سامنا نہ ہوا۔ کسی قسم کی اندرونی یا بیرونی خلش نہیں پیدا ہوئی۔ مدتوں اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے رہے۔ اور اس دم خم کے ساتھ کہ کسی کو اس مرض کا علم نہ ہو تو وہ صرف یہ اندازہ کر سکتا۔ کہ کوئی معمولی سا پھوڑہ پھنسی ہے۔ جس پر پٹی بندھی ہوتی ہے۔ اس عمر اور اس مرض میں نظام جسمانی کا ایسا توازن اور قوت ارادی کی یہ پختگی حیرت انگیز ہے۔

جب تک بالکل ہی صاحب فراش نہ ہو گئے۔ فرائض متعلقہ پابندی اور تن دہی سے بجا لاتے رہے۔ ایک بار پرو وائس چانسلر صاحب مولانا کو دیکھنے گئے۔ مرض شدت پر تھا۔ گفتگو مشکل سے کر سکتے تھے۔ زنان خانہ میں ملاقات ہوئی۔ پرو وائس چانسلر صاحب نے چاہا کہ کچھ تسکین اور ہمدردی کے الفاظ کہیں۔ مولانا نے سبقت کی اور مشرق کے جنوبی سلسلہ عمارات میں ترمیم کا نقشہ پیش کیا۔ اسی دوران میں مسجد کے بعض دیگر انتظامی مسائل بھی چھیڑ دیئے اور اس اعتماد سے گفتگو کی جیسے کوئی شخص تندرستی کی حالت میں اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ایسا ہو گیا تو اس کے کارناموں میں بڑا اضافہ ہو جائے گا۔ پرو وائس چانسلر صاحب چلنے لگے تو چند کلمات تسکین و ہمدردی کے کہے۔ مرحوم نے ان کلمات کی قدر کی لیکن اس طرح پر بالکل نہیں جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل جاتا ہے۔ بلکہ اس بشاشت اور دلیری سے جیسے وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہی نہ تھے۔

"مولانا سلیمان اشرف صاحب مرحوم" کے جنازہ کے ساتھ قبرستان تک بڑی پامردی سے گئے۔ وہاں نماز جنازہ پڑھانے کا سوال اٹھا تو اس بنا پر معذوری کا اظہار کیا کہ رخسارہ کے زخم سے ریم آتی تھی لیکن ان کے بشرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اس معذوری کا کیسا شدید

صدمہ تھا۔ قبرستان سے واپس ہوتے ہوتے فرمایا، اس آخری خدمت کے بجا لانے کا افسوس ہے۔ سر والا اُٹھ گیا!

اسٹریچی ہال میں کسی کے پذیرائی کی تقریب تھی، مرض کی ابتدائی حالت تھی لیکن تکلیف بہت تھی۔ اس موقع پر مولانا کو جلسہ کے افتتاح کے سلسلہ میں کلام پاک کی تلاوت کرنی تھی۔ ہم سب نے عرض کیا کہ مولانا آپ تکلیف نہ فرمائیے، کوئی اور تلاوت کر دے گا۔ فرمایا۔ نہیں، کوئی مضائقہ نہیں، ایسی بھی کیا تکلیف کہ کلام پاک کی چند آیات نہ تلاوت کر سکوں۔ چنانچہ مولانا ٹھیک وقت پر اسٹریچی ہال پہنچے۔ سر اور رخسارہ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ چہرہ تکلیف سے تمتما یا ہوا تھا۔ لیکن وقت آیا تو اپنا ڈنڈا لئے ہوئے ڈائس پر پورے وقار اور مستعدی سے آئے۔ آواز میں کہیں تزلزل یا تذبذب نہ تھا۔ چند آیتیں تلاوت فرمائیں اور براہ راست مکان واپس آ گئے۔

مرض بہت کچھ بڑھ چکا تھا۔ ایک دن شام قریب تھی۔ سب لوگ بیٹھے ہوئے تھے کہ آنے میں ہم سب کے بڑے دیرینہ شناسا ایک افغانی پٹھان آ گئے جو مشک، زعفران، بعض ادویات، شال اور سمور وغیرہ کی گشتی تجارت کرتے تھے۔ حاضرین پر ایک طرح کی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ خان کا غیر متوقع ایسی حالت میں آنا ہم لوگوں کو گراں گذرا۔ لیکن مولانا نے اس ضغطہ کو بڑے لطف و محبت کے ساتھ دور کیا۔ لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا دیا۔ مصافحہ کے بعد اشارہ سے مزاج پرسی کی اور لمحہ بھر بعد لڑکھڑاتی آواز میں لیکن لطف کے ساتھ پوچھا، کیوں خان ہمارے لئے کیا لائے۔ خان نے جواب دینے میں تامل کیا تو بولے زعفران اور مشک۔ لائے ہو۔ خان نے کہا۔ مولانا اللہ آپ کو شفا دے۔ سب کچھ حاضر کروں گا۔ مرحوم نے بڑے شوق سے ساری چیزیں دیکھیں۔ اور بہت کچھ خریدیں۔ اسی لطف و شوق سے جیسے اکثر تندرستی میں کیا کرتے تھے۔

مسلسل مصائب بالخصوص بیماری کا ایک خاصا یہ بھی ہے۔ کہ وہ انسانی کمزوریوں کو ابھار دیتی ہے۔ آدمی زود رنج اور تنگ مزاج ہو جاتا ہے۔ صحت وعافیت میں جن لوگوں کی طبیعت متوازن ہوتی ہے۔ مرض ومصیبت میں بالعموم یہ توازن قائم نہیں رہتا۔ میرا اور مولانا کا مسلسل دن رات کا پندرہ سال تک ساتھ رہا۔ میں نے ایک دن بھی یہ نہ دیکھا کہ مولانا کسی پر برہم ہوتے ہوں۔ یا زبان سے کوئی غیر ثقہ کلمہ نکلنے دیا ہو۔ بچوں پر چھوٹوں پر، نوکروں پر، بعض نامعقول لوگوں پر آدمی کبھی نہ کبھی غصہ کرتا ہی ہے لیکن یہ عجیب بات تھی کہ مولانا کبھی کسی حال میں آپے سے باہر نہیں ہوتے۔ کم سے کم میں نے ان کو کبھی اس حال میں نہ دیکھا ہمیشہ سنجیدہ یا شگفتہ پائے گئے۔

اس مسلسل و مہلک بیماری میں وہ ہر مرحلہ سے گزرے، ہر طرح کی سختیاں جھیلیں، توقعات کے خلاف اس سلسلہ میں ان کو مایوسی بھی ہوتی۔ سخت زیر بار ہوئے، بعض صدمے بھی اٹھائے لیکن کوئی ناملائم کلمہ کسی کے خلاف بھی نہ نکالا۔ تیور سے بھی کبھی مایوسی یا بیزاری کا اظہار نہ کیا ایک دن تکلیف زیادہ تھی، تھوڑی بہت گفتگو کر لینے پر قادر تھے لیکن تکلیف کا ایسا غلبہ تھا کہ گفتگو کرنے کا یارا نہ تھا۔ اتفاق سے اسی دن ایک معزز بزرگ ملنے تشریف لائے اور مولانا سے ہمدردی کی گفتگو شروع کر دی۔ مولانا نے فرمایا الحمدللہ اچھا ہوں۔ جواب میں یہ کلمہ ہمیشہ مولانا کی زبان سے نکلا۔ مزید گفتگو ہوئی تو فرمایا، دیکھئے تو کتنی عمر پائی اور کس فراغت وعزت سے زندگی بسر ہوئی۔ آخر کوئی وقت تو آنا جب یہ دور ختم ہوتا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس حال میں ہوں ممکن تھا کہ اس سے بھی بدتر حالت ہوتی!

جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو زنان خانہ سے نکلنا ترک کر دیا تھا۔ ملنے والے وہیں مل آیا کرتے۔ میں عرصہ سے دیکھنے نہیں گیا تھا۔ یہ میری نامعقول کمزوری ہے کہ میں ایسی حالت میں

کسی کو نہیں دیکھ سکتا - آدمی بھیج کر بُلوایا، اندر پہنچا تو تخلیہ تھا، میں نے ذرا دُور بیٹھنا چاہا اشارہ سے قریب بُلایا! اب گفتگو کرنے میں بڑی دقت ہونے لگی تھی اس لئے خود میں نے کچھ نہ کہا ہاتھ اور آنکھ کے اشارہ سے پوچھا کہاں تھے - میں نے عرض کیا مولانا بس یونہی نہیں آنا ہوا - خیریت دریافت کر لیا کرتا تھا، حالانکہ خیریت دریافت کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی تھی - اس لئے کہ کوئی اطمینان بخش خبر نہ ملی اور نہ اس کی توقع ہوتی - لوگ جو کچھ آپس میں تذکرہ کرتے - اُسی پر اکتفا کر لیتا تھا - اور چاہتا کہ یہ تذکرہ ختم ہو - اور کوئی دوسری بات شروع ہو جائے مرحوم تھوڑی دیر تک خاموش میری طرف دیکھتے رہے - پھر بڑی کوشش سے اٹک اٹک کر ناصاف لفظوں میں فرمایا، پریشان نہ ہو، اللہ نے چاہا تو اچھا ہو جاؤں گا -

اب مجھ سے نہ رہا گیا - میں نے بے اختیار کہنا شروع کیا - مولانا کیا کروں جو کچھ بس میں تھا سب کر دیکھا - اب کچھ بن نہیں پڑتی اپنے بس کی چیز تو روپیہ پیسہ دوڑ دھوپ محنت اور ماتم ہی ہے - یہ سب بیکار ثابت ہوتے اب تو صرف دیکھتے رہنا رہ گیا ہے - اس کی بھی ہمت نہیں رہی - مولانا بڑے غور سے سُنتے رہے - پھر ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا - اور دیر تک پکڑے رہے - داہنا ہاتھ خالی تھا اُسے اٹھایا اور انگشت شہادت سے آسمان کی طرف اشارہ کیا - معلوم ہوا جیسے کوئی چیز گلوگیر ہے ہلکے سے کھانس کر گلا صاف کیا اور بولے وہ دیکھتا ہے"۔

میں چلا آیا - یہ آخری ملاقات تھی، تعطیلوں میں میں پہاڑ چلا گیا - جس رات کو روانہ ہونے والا تھا طبیعت کا عجیب حال تھا - جی چاہتا تھا کہ مولانا کو آخری بار دیکھ آؤں - اس لئے کہ سمجھتا تھا کہ اب دائمی مفارقت کی ساعت دور نہیں ہے - دوسری طرف اپنے میں اس کی سکت نہ پاتا تھا کہ یادداشت کی اس آخری نقش کی کسک کبھی دل سے محو کی جا سکے گی - دیر تک اسی حیص بیص میں رہا - بالآخر اس فیصلہ پر پہنچا کہ سلام کر ہی آؤں - وہاں پہنچا تو در و دیوار

اور وہ تمام چیزیں، اشخاص اور یادگاریں ایک غم ناک ہجوم میں پڑھتی پھیلتی، دل و ذہن پر چھا گئیں جن سے سالہا سال سے سابقہ تھا۔ ہمت چھوٹ گئی اور بے سلام کئے بغیر لوٹ آیا۔ تعطیلوں بعد واپس ہوا تو مرحوم اپنے وطن جا چکے تھے۔ اور وہیں سے مقررہ وقت پر نہ ایک ساعت اِدھر نہ ایک ساعت اُدھر جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔

مرحوم اصغر گونڈوی

انداز ہیں جذب اس میں سب شمع شبستان کے
اک حسن کی دنیا ہے خاکستر پروانہ

دنیا کی بھلی یا بری باتیں دنیا کے بھلے یا برے لوگوں سے ثابت ہوتی ہوں یا نہیں سمجھ میں اسی طرح آتی ہیں، ماں باپ بھائی بہن احباب سب کی محبت میری سمجھ میں تو اپنے ہی ماں باپ بھائی بہن اور دوستوں کی محبت سے آتی۔ اصغر صاحب مرحوم میں جو خوبیاں تھیں ممکن ہی نہیں یقین ہے دوسروں میں بھی ہوں گی لیکن مجھے وہ خوبیاں اس لئے زیادہ عزیز تھیں کہ وہ اصغر صاحب کی خوبیاں تھیں جن کی وفات نے ان کو عزیز تر و گرامی تر بنا دیا تھا۔

اصغر صاحب مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۵ء کے جاڑوں میں مدرسۃ العلوم کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر علی گڑھ میں ہوئی تھی۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ مولانا اقبال احمد صاحب سہیل (علیگ) ہی کے توسل سے ہوئی جنھوں نے ڈاکٹر صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۵ء میں کرائی تھی۔ اس وقت تک میں اصغر صاحب کی ذات یا کلام دونوں سے ناآشنا تھا۔ مولانا سہیل سے البتہ پرانی یاد اللہ تھی۔ رات کے آٹھ بجے تھے۔ مولانا اور اصغر صاحب ساتھ ہی میرے مکان پر تشریف لائے۔ میں گھر میں تھا سہیل صاحب کی اطلاع ہوئی تو میں بے اختیار باہر آیا اور بہت سے غیر ذمہ دارانہ فقرے کچھ ادھورے کچھ پورے ورد زباں کرتا آیا اس لئے کہ میں نے مولانا سہیل جیسا بے پناہ برجستہ گو اور دقیقہ سنج آدمی اب تک نہیں دیکھا ہے وہ عالمانہ نکتوں اور فقروں کو اس لطف و صناحت کے ساتھ ایک دوسرے میں سموتے ہوتے برمحل و مسلسل جسارت کرتے چلے جاتے ہیں کہ طبیعت عش عش کر جاتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ انھوں نے پہل کر دی تو ان کا قابو میں لانا ناممکن ہو جائے گا اس لئے میں گھر سے تیار ہو کر نکلا تھا۔

نہیں کچھ کہنے والا ہی تھا کہ سامنے ایک صاحب نظر آئے۔ کمرہ چھوٹا تھا، دروازے بند اور روشنی مدھم، کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اجنبی کے قد و قامت کے مقابلہ میں کمرہ کی وسعتیں لحظہ بہ لحظہ سمٹتی جا رہی ہیں۔ دراز قد، متوسط جسم، ستھری دخوش قطع پوشاک سر پر پٹے سڈول بھری بھری فرنچ کٹ ڈاڑھی، سر پر بالوں کی اونچی ٹوپی، چہرہ پر اجالا آنکھوں میں خلوص، کی گہرائی اور فراست کی شگفتگی تبسم میں شرافت، متوسط عمر انداز میں خود اعتمادی و دل آسائی۔ بیک نظر دل نے گواہی دی کہ اچھے آدمی سے ملاقات ہوئی یہ اصغر صاحب مرحوم تھے۔

اصغر صاحب کسی قدر جھکے ہوتے تھے جھکنا ایسا تھا جیسے کوئی بڑا آدمی بڑائی اور بھلمنساہٹ سے جھک گیا ہو۔ یہ جھکاؤ اعضا کا نہیں انداز کا جھکاؤ تھا۔ مسکرانا ایسا

جیسا کسی واقعہ پر نہیں مسکرا رہے ہیں بلکہ تبسم ان کی شخصیت کا وجود تھا۔ ان کا مسکرانا لب و دہن کا مسکرانا نہ تھا۔ بلکہ چہرے کی فضا ہی ایک مستقل شگفتگی تھی۔ مولانا سہیل سے میں بے تکلف ہی نہیں گستاخ بھی تھا۔ مولانا بولے، ملو ایک انسان لایا ہوں میں نے کہا شکریہ ہے آپ نے محسوس تو کیا کہ آپ کے ساتھ کسی انسان کا وقتاً فوقتاً رہنا بہت ضروری ہے۔ بولے ملو، ملو۔ اصغر صاحب ہیں۔ اصغر صاحب مسکرا کر آگے بڑھے اور بغل گیر ہو گئے اور میں نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے محبت اور رحمت کے لمس نے مجھے کشش ثقل سے آزاد کر دیا ہو۔

مولانا سہیل نے اتنی فرصت غنیمت سمجھی اور اپنے بندھے ہوئے بستر پر بیٹھ گئے پاس ہی لوٹا تھا اسے اس طور پر اٹھا لیا جیسے میرے ہاتھ اسے چھینے والے تھے۔ مجھ سے اصغر صاحب کے بکس پر بیٹھنے کو کہا اور ابھی میں بیٹھنے کیا سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ بولے سنو اصغر صاحب کا ایک شعر سناتا ہوں۔ ابھی شعر کی باری نہیں آئی تھی کہ بولے اصغر صاحب بس کسر یہ رہ گئی۔ کہ ڈاکٹر نہیں ہیں ورنہ دیکھتے کیا لطف آتا۔ پھر ایک خاص ترنم سے پیشہ وروں کے نہیں بلکہ ڈھیلے مانسوں کے ترنم میں پڑھا۔

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

مولانا سہیل شعر کے بڑے اچھے پارکھ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اچھے شعر سن کر نئی اور اچھوتی دنیا نئیں بنا دینے میں کمال رکھتے ہیں۔ میں کسی میں نہیں لیکن اچھا شعر مجھ پر کچھ ایسا ہی اثر کرتا ہے جیسے اچھا کام کرنے سے خوشی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ مجھ پر شعر کا کیا اثر ہوتا ہے۔ یہ جو میں نے بتایا ہے وہ محض مثال کے طور پر ہے اور مثال پر

مجھے بھروسہ نہیں ہوتا کیونکہ دُنیا میں سارا جھگڑا اسی شال کا سہارا لینے سے پیدا ہوا ہے
میں نے کہا مولانا شعر بڑے مزے کا ہے للہ اسے بکس و بستر پر بیٹھ کر اور لوٹا ہاتھ میں
لے کر غارت نہ کیجئے۔ سب لوگ اطمینان سے بیٹھے، کھانا آیا مولانا نے فرمایا اصغر صاحب
ذرا روح نشاط تو نکالنا، ان کو اشعار سناؤں میں نے عرض کیا مولانا ذرا چھری تلے دم لینے دیجئے۔
جاڑا پڑ رہا ہے انگیٹھی آ گئی ہے۔ کھانا کھا کر چلتے کا دَور ہوگا۔ پھر کھوٹ سچ ملایا جائیگا۔
آپ تو اشعار کا بیوپار کرتے ہیں۔ اس سے اصغر صاحب کی دُنیا اور میری عاقبت خراب ہوتی
ہے۔ آپ کا کیا نہ دنیا کے قابل نہ عقبیٰ کے قائل! مولانا ایک خاص انداز سے مُنہ پر ہاتھ
رکھ کر ہنسے دونوں پاؤں گھٹنے سے موڑ کر کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے جھولا سا جھولنے لگے۔ یہ
مولانا کے ابتہاج و اہتزاز کی خاص علامت ہے۔

۱ ناظرین معاف فرمائیں، ابتہاج و اہتزاز ایسے الفاظ استعمال کرنے میں مجھے کبھی
اور ضرور تامل ہوتا لیکن جب بھلے مانس اور سمجھدار موجود ہوں تو الفاظ دقیق ہوں۔ خواہ
غیر مانوس ان کے برمحل و بے تکلف استعمال کرنے میں ذوق کو تسکین ہوتی ہے۔
جاہلوں اور لیڈروں کے اس دور میں دقیق یا نازک مفہوم کو موزوں و مکمل الفاظ سے
ادا کرنے کو ترس گیا۔ ابلہوں کو کون سمجھاتے کہ صاحب ذوق عربی، فارسی یا کسی اور زبان
کے الفاظ قابلیت کی نمائش یا تعصب کی بنا پر نہیں کرتے۔ بلکہ مافی الضمیر کو آسانی سے
منتقل کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ عوام یا لیڈر کی سمجھ میں وہ لفظ نہ آتے تو ہم خوش اور ہمارا
خدا خوش۔ ہم کب چاہتے ہیں کہ آپ نرے احمق اور جاہل بھی ہوں اور ہمارے جواہر پاروں
سے کھیلتے بھی رہتے ہیں۔

۲ عوام کو خوش کرنا بڑے ثواب کی بات ہے لیکن کوئی موقع تو ایسا ملنا چاہئے جب

ہم اپنا اور اپنوں کا جی اپنے طور پر خوش کر سکیں۔

سب لوگ اطمینان سے بیٹھے ایسے موقع پر اطمینان سے بیٹھنے کے معنی اپنے اپنے بستر پر لحاف اوڑھ کر لیٹ جانے اور جس کے جی میں جو آتے کہہ گزرنے کے ہیں۔ نہ قوم کے تباہ ہونے کی پروا اور نہ زندگی کے فانی ہونے کا غم۔ آواز دی اندر سے پان آ گئے انگیٹھی سرد ہونے لگی۔ نوکر نے کوئلے ڈال دیے۔ نہ اندر سے کسی کے بلانے کی ہمت نہ باہر سے کسی صاحب کے آنے کا خطرہ۔ نیند آئی سو گئے جی چاہا بستر ہی پر رقص کرنے لگے۔

مولانا سہیل نے فرمایا اچھا اصغر صاحب روح نشاط تو نکالئے۔ مرحوم نے کہا اس کی ضرورت کیا ہے۔ آپ کو تو یونہی سب کچھ حفظ ہے۔ میں نے کہا مولانا ذرا ٹھہریئے ابھی پہلا ہی شعر حلق سے نیچے نہیں اترا ہے۔ مولانا نے نہایت متانت سے فرمایا جلدی کیجئے ورنہ پھندا لگنے کا اندیشہ ہے میں نے کہا رند نے ظرف تو اٹھا لیا لیکن ابھی ساغر بننا باقی ہے۔ اس کے بعد پینے اور میخانے بننے کا سوال آئے گا۔ مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ اصغر صاحب نے جو شعر کہا ہے اسے وہ ہماری دنیا میں آباد بھی کر سکتے ہیں کہ نہیں۔ متاع یوسفی مسلم لیکن دام تو مصر ہی کے بازار میں لگیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جہاں میرے آپ جیسے ناگفتنی موجود ہوں۔ وہاں اصغر صاحب ساغر و میخانہ کی فضا بھی پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اصغر صاحب ہنس پڑے کہنے لگے رشید صاحب ساغر و میخانہ کی فضا شاعر نہیں پیدا کرتے۔ کلال پیدا کرتے ہیں شاعر تو شرافت و شہامت کا اعلان کرتا ہے۔ مسجد میخانہ یا میدان مصاف کا انتخاب تو ہر شخص اپنے اپنے ظرف سے کرتا ہے۔ علی گڑھ میں ساغر و میخانہ کی کیا کمی۔ کمی تو رندوں کی ہے۔ میں نے کہا ٹھیک فرمایا۔ لیکن یہ تو بتایئے مولانا سہیل کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کہنے لگے ان کی نہ پوچھئے تمام عمر میخانہ میں رہے نکلے تو محتسب بن گئے۔

میں نے کہا محتسب ہی نہیں گواہ سرکاری بھی۔ علی گڑھ سے نکل کر ان کا یہ حشر ہوا۔ نکالے گئے ہوتے تو یقیناً رند ہوتے مولانا بولے نکالا جاتا تو تمہارا کیا حشر ہوتا میں نے کہا وہی جو اب اصغر صاحب کا ہے۔ اس پر مولانا اور اصغر صاحب دونوں نے قہقہہ لگایا۔

دوسرے دن اصغر صاحب نے نشاطِ روح کا ایک نسخہ بڑی محبت سے دیا کچھ دن بعد مرحوم نے پوچھا آپ نے نشاطِ روح کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ میں نے کہا اصغر صاحب اس وقت مولانا سہیل موجود نہیں ہیں آپ خود کچھ متفرق اشعار سنائیے یہ شخص بلا سبب درمیان میں شعر سے لطف اٹھانے نہیں دیتا سوچنے کے بجائے تجزیہ میں ڈال دیتا ہے وہ دیکھئے احاطہ کے پھاٹک پر کسی بزِ اخفش سے الجھا ہوا ہے۔ یقیناً اس سے وہ باتیں بیان کر رہا ہوگا جو افلاطون و ارسطو سے کرنا چاہئے تھیں۔ اصغر صاحب نے فرمایا متفرق اشعار نہ سناؤں گا، پوری غزل سنئے شاعر کو اسی طرح سننا چاہیئے۔ تصور سے ہمکنار ہو جیئے تصویر دیکھ کر کیا کیجئے گا۔ پھر یہ غزل سنائی۔ کیسا نرم رنگین و گوارا لہجہ تھا۔

گلوں کی جلوہ گری مہر و مہ کی بوالعجبی — تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی
گزر گئی ترے مستوں پہ وہ بھی تیرہ شبی — نہ کہکشاں نہ ثریا نہ خوشۂ عنبی
یہ زندگی ہے یہی اصل علم و حکمت ہے — جمال دوست و شب ماہ و بادۂ عنبی
فروغ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے — ادائے رسم بلالی و طرز بولہبی
سرشت عشق طلب اور حسن بے پایاں — حصول تشنہ لبی ہے شدید تشنہ لبی
وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں — جہاں سے تو نے لیے خندہ ہائے زیر لبی

کشش نہ جام نگاریں کی پوچھ اے ساقی
جھلک رہا ہے مرا آب و رنگ تشنہ لبی

دس گیارہ سال ہوتے ایک دفعہ ایسا بیمار پڑا کہ زندگی کے لالے پڑ گئے لکھنؤ میڈیکل ہسپتال میں مدتوں صاحب فراش رہا اس زمانہ میں اصغر صاحب الہ آباد میں تھے۔ تقریباً ہر اتوار کو میں ہسپتال کے بالاخانہ پر اپنے کمرہ کے قریب ٹھیک نو بجے دن کو ایک خاص آہٹ سنتا۔ دروازہ کھلتا۔ اصغر صاحب آہستہ آہستہ لیکن مستقل اور ہموار قدموں سے کمرہ میں مسکراتے ہوئے داخل ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ کچھ دیکھ کر یا محسوس کر کے خوش ہو رہے ہیں سلام علیکم اس لہجہ و انداز سے کرتے جیسے کوئی خوش خبری سُنا رہے ہیں۔ کرسی پر بیٹھ جاتے مجھ سے تو کیا کسی اور سے بھی نہ پوچھتے۔ کہ کیسا ہوں یا کیا ہو رہا ہے بات اس انداز سے کرتے جیسے مجھے دیکھنے کے لئے کوئی لمبا سفر کر کے نہیں آتے تھے۔ بلکہ ہسپتال تک ٹہلنے کے لئے آتے تھے۔ میری طرف بھی آ نکلے۔ باتیں ایسی چھیڑتے جن کا تعلق دور دور تک بھی مرض یا ہسپتال سے نہ ہوتا۔

اسی زمانہ میں میرا ایک مضمون شیطان کی آنت شائع ہوا تھا۔ میں نے ایک بار پوچھا۔ اصغر صاحب یہ آپ ہر ہفتہ الہ آباد سے یہاں کیوں آتے ہیں اور زحمت و زیر باری اٹھاتے ہیں۔ کچھ سوچا پھر مسکرا کر بولے شیطان کی آنت کھینچ لاتی ہے۔ میں نے کہا فرشتوں کو بھی! فرمایا فرشتہ کو شیطان ہو جاتے بھی تو آپ نے سُنا ہوگا۔ میں نے کہا اصغر صاحب تکلیف نہ ہو تو کچھ سنائیے اصغر صاحب میری اس رغالباً غیر متوقع) فرمائش پر بہت مسرور ہوئے اور ذیل کی غزل بڑے لطف سے سُنائی۔

سرگرم تجلی ہو اے جلوۂ جانانہ ‏ ‏ ‏ اُڑ جائے دھواں بن کر کعبہ ہو کہ بُت خانہ

بردیں ہو دُنیا ہے یہ کعبہ وہ بُت خانہ ‏ ‏ ‏ اک اور قدم بڑھ کر اے ہمت مردانہ

قربان ترے میکش ہاں اے نگہ ساقی ‏ ‏ ‏ تو صورت مستی ہے تو معنی میخانہ

اب تک نہیں دیکھا ہے کیا اُس رُخ خنداں کو ‏ ‏ ‏ اک تار شعاعی سے اُلجھا ہے جو پروانہ

مانا کہ بہت کچھ ہے یہ گرمیِ حسنِ شمع — اس سے بھی زیادہ ہے سوزِ غمِ پروانہ
زاہد کو تعجب ہے صوفی کو تحیّر ہے — صد رشکِ طریقت ہے یہ لغزشِ مستانہ
اک قطرۂ شبنم پر خورشید ہے عکس آرا — یہ نیستی و ہستی افسانہ ہے افسانہ

انداز ہیں جذبؔ اس میں سب شمعِ شبستاں کے
اک حسن کی دنیا ہے خاکسترِ پروانہ

گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر واپس جاتے وہ بھی اس طرح جیسے رخصت نہیں ہو رہے بلکہ یوں ہی باہر جا رہے ہیں۔ جب میں صحت یاب ہو کر واپس آ گیا۔ تو ایک عرصہ کے بعد معلوم نہیں کس سلسلہ میں میں نے پوچھا کیوں اصغر صاحب آپ ہسپتال میں مجھے دیکھنے آتے تو آپ پر ایک طرح کی شگفتگی کیوں طاری رہتی۔ میں نے آپ کو اخلاقاً بھی کبھی فکر مند نہ پایا کیا میری ہمت افزائی مقصود تھی۔ بولے بالکل نہیں اچھا سنئے ایک لطیفہ سناتا ہوں۔

ایک دن میں اکیڈمی سے مکان واپس آ رہا تھا . . . . صاحب راستہ میں ملے اور نہایت غم ناک لہجہ میں بولے۔ اصغر صاحب بڑے افسوس کی بات ہے۔ رشید صاحب کا انتقال ہو گیا ایسے تھے ویسے تھے۔ میں سن کر ہنس پڑا اور بولا حضرت حواس کی باتیں کیجئے انتقال کرنا کیسا۔ میں جانتا ہوں وہ زندہ ہیں اور تندرست ہو کر رہیں گے۔ انہوں نے مجھے بدحواس یا بیوقوف سمجھا اور لگے اپنی خبر کے موثق ذرائع بتانے گنانے میں نے کہا یہ سب صحیح لیکن میں ہر ہفتہ دیکھ آتا ہوں ان کی پیشانی پر نہایت جلی نقوش میں "حیات" لکھی ہوئی ہے وہ نہ مانے۔ میں نے کہا آپ نہیں مانتے تو آپ تار دے کر دریافت کر لیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور خبر غلط نکلی۔ رشید صاحب واقعہ یہ ہے کہ جب لکھنؤ پہنچ کر آپ کو دیکھتا تو فوراً یہ نظر آتا کہ زندگی اپنی پوری تابش و تازگی کے ساتھ موجود ہے۔ اور میں مسرور و مطمئن ہو جاتا۔

دس بارہ سال تک اصغر صاحب کا ساتھ رہا۔ انہیں میں نے ہر حال میں دیکھا اور ہمیشہ اصغر صاحب ہی پایا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ شاعر بھی تھے شاعر نہ ہوتے جب بھی ان کے شرف یا شہرت میں فرق نہ آتا۔ وہ جس موقع یا ماحول میں ہوتے ممتاز و محبوب رہتے۔ وہ کچھ عالم متبحر نہ تھے لیکن اردو کے بہت سے شعرا سے کہیں زیادہ ذی استعداد و ذی علم تھے۔ بڑی رسا طبیعت تھی۔ نئے سے نئے اور پیچیدہ سے پیچیدہ علمی مسائل کی تہ تک اس سہولت اور صفائی سے پہنچ جاتے۔ کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہوتا کہ اس مرحلہ سے ان کا یہ سابقہ پہلے ہی بار پڑا تھا۔ انگریزی کی خواندگی کچھ زیادہ نہ تھی۔ اور نہ فن تنقید کے جدید ترین اصول سے آشنا تھے لیکن ہندوستانی اکیڈمی کے مشیر ادبی کی حیثیت سے ان امور سے سابقہ پڑا تو آپ کے قلم سے نہایت متوازن مستند و بے لوث تنقیدیں نکلیں۔ اور ترجمہ تو ایسا کرتے کہ اکثر اصل کا دھوکا ہوتا پکے مسلمان اور مشرقی تھے۔ لیکن میں نے بڑے بڑے مغربیت مآبوں کو اصغر صاحب کی بصیرت اور ہمہ جہت شخصیت کا معترف پایا۔ اردو میں عام نثر نگاروں کے برخلاف وہ اپنی تحریر میں زور، رنگینی اور وزن پیدا کرنے کے لئے حشو و زوائد سے کام نہیں لیتے تھے۔ اردو کے اکثر مستند اہل قلم بھی الف لیلہ کے بکھارے سے ملتے جلتے ہیں۔ بات اتنی معمولی ہوگی کہ اسے نہ بھی کہیں تو مہرج نہیں۔ لکھیں گے اس طرح جیسے دواؤں کا اشتہار لکھ رہے ہیں، ہندو مارے ڈالتا ہے، یا محبوبہ بھاگ گئی ہے، مرحوم تحریر و تقریر دونوں میں حفظ مراتب ملحوظ رکھتے تھے۔ انڈین پریس الہ آباد کی فرمائش پر انہوں نے "تحفوں" کا ایک سلسلہ بچوں کے لئے تصنیف کیا جس میں مختلف ممالک کے حالات سے بچوں کو بڑے دل نشیں انداز سے روشناس کرایا ہے۔ کچھ دنوں لاہور کے ادبی مرکز میں بھی علمی خدمات انجام دیں۔ منتخبات کے بعض سلسلے اصغر صاحب ہی کے مرتب کئے ہوتے ہیں اور بڑے مستند اور وقیع سمجھے جاتے ہیں۔

مرحوم نے ایک مستقل تصنیف "اردو کی ذہنی تاریخ" شروع کی تھی۔ کئی سو صفحات کا مسودہ
ان کے کاغذات میں اب تک موجود ہے۔ لیکن اوراق اتنے بوسیدہ اور گڈمڈ ہو گئے ہیں۔
اور حواشی اس کثرت سے لکھے ہیں کہ ان کا مرتب کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

اصغر صاحب کی آمدنی بہت کم تھی لیکن میں نے ان کو کبھی تنگدستی کا شاکی نہ پایا۔ بڑا خرچ تھا۔
بہت اچھا پہنتے تھے اس سے اچھا کھاتے تھے۔ اپنی حیثیت سے زیادہ مدارات کرتے تھے۔
ان سے دس گنی آمدنی والوں کو بھی میں نے ان جیسا رکھ رکھاؤ رکھنے والا نہیں پایا۔ ان کے جسم
پر یا گھر میں کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی گئی جس سے شبہ بھی ہو سکتا کہ محض شوق پورا کرنے کی خاطر
دوسرے یا تیسرے درجہ کے بدل پر اکتفا کیا ہے۔ ان کی ہر چیز میں ذوق و سلیقہ کی شہادت ملتی تھی۔
آج تک میلے اور پیوند لگے لباس میں نہیں دیکھے گئے۔ گفتگو میں رکیک یا سخیف فقرے زبان سے
نہ نکالتے۔ گفتگو آہستہ کرتے مسکرا کر کرتے لہجہ ہمیشہ نرم پُر وقار یا شگفتہ ہوتا۔ میں نے ان کو کبھی
مایوس، مضمحل یا مضطرب نہ پایا ان کے ملنے والے مختلف یا متضاد مشرب کے لوگ بھی تھے لیکن
وہ گفتگو اس انداز سے کرتے کہ اپنی وضع بھی ہاتھ سے نہ جاتی۔ اور دوسرا بھی مایوس یا منغض نہ ہوتا۔

الہ آباد میں پہلے پہل انہوں نے کٹرہ میں ایک مکان دوکانوں کے ذیل میں لبِ سڑک لے لیا
تھا۔ بیٹھک میں براق چاندنی کا فرش، تین چار گاؤ تکیے، الماریوں پر روغن دیوار پر قلعی۔ میں
ملنے گیا تو پوچھا، کیوں مکان ملنے میں تو دشواری نہیں ہوئی؟ میں نے کہا جی نہیں البتہ ذرا
شبہ ضرور ہوا کہ آپ کا مکان ہے یا حکیم اجمل خاں کا مطب۔ خدا کے لئے اس جگہ کو چھوڑ دیجئے۔
لوگ بیٹھے ہوں تو شبہ ہو کہ یا تو مخصوص امراض کے مریض جمع ہیں یا آپ خاص قسم کے پیر
ہیں۔ گھوڑے پر چوکا لگانے سے فائدہ؟ مجھے تعجب ہے آس پاس کے دوکانداروں نے آپ
پر اب تک جملہ کیوں نہیں کس دیا۔ اگر جلد چھوڑنا ممکن نہ ہو تو ہومیوپیتھک دواؤں کا کاروبار

کیوں نہ شروع کر دیجئے۔ اصغر صاحب ہنس پڑے فرمایا آپ نے بات ٹھیک کہی۔ مجھے صفائی بہت پسند ہے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں جب میں باہر سے آتا تھا تو بیک نظر یہ صفائی خود مجھے کھٹکتی تھی۔

بازار میں کوئی چیز نئی آتی تو اُسے فوراً خرید تے، دوستوں کو دکھاتی جاتی۔ کوئی پسند کر لیتا تو اُسی کے نذر کر دیتے۔ ایک دفعہ مراد آباد سے نہایت باریک اور حسین نقشے کی سینی لائے۔ راستہ میں میرے ہاں ٹھہر گئے۔ سینی دکھائی، پوچھا کہئے کیسی ہے میں نے کہا عشوہ ہے عشوہ "فتوحات" میں سے ہے یا خریدی ہے؟ بولے جی نہیں، فتوحات کا یہاں کیا گذر میں نہ ملّا نہ انگریز خوشی تو خریدنے کی ہوتی ہے۔ میں نے پوچھا کیا قیمت دی کہنے لگے واہ پسند کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے سنا نہیں۔

جو کچھ کہا کہ ترا حسن ہو گیا محدود!

بس یہ آپ کی نذر ہے۔ وہ سینی اب تک میرے پاس ہے۔ بچوں کے گھر میں اس کی صورت مسخ ہو گئی ہے۔ اب مجھے جب کبھی نظر آجاتی ہے تو اُسے منجواتا ہوں۔ اُسی میں کھانا منگوا کر کھاتا ہوں۔ رنگ آمیزیاں غائب ہو چکی ہیں۔ نقوش دھندلے ہو گئے ہیں میں حافظہ کا کچا ہوں۔ لیکن تاثرات دیر تک قائم رہتے ہیں۔ ان مٹتے ہوئے نقوش میں اصغر صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور جاننے والے جانتے ہیں، بچھڑے ہوئے دوست کی یاد تازہ ہوتی ہے تو ماضی کے سیمیائی پردوں پر رنگ و آہنگ، خط و خال رعنائی و زیبائی کے کیسے کیسے حزیں و حسین نقشے بن بن کر مٹتے ہیں اور مٹ مٹ کر بنتے ہیں!

اصغر صاحب کھلانے پلانے کے بڑے شوقین تھے۔ میں آنے والا ہوتا تو عجیب عجیب اہتمام کرتے، مرحوم کا انتقال فالج میں ہوا۔ پہلا حملہ سہنے کو سہہ گئے مگر ہاتھ پاؤں کمزور ہو گئے تھے۔ پاؤں مشکل سے ہموار پڑتے۔ آخر آخر میں الٰہ آباد کے سینٹ ہال کے سامنے بلو بڈیر

کے احاطہ میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا۔ مکان کے احاطہ کے پھاٹک تک ایک طویل راستہ تقریباً پون فرلانگ لمبا چلا گیا تھا۔ میرا الہ آباد پہنچنے کا وقت متعین تھا۔ میں نے ہمیشہ انتظار میں انہیں اس طویل سڑک پر ٹہلتے ہوئے پایا۔ اس میں کچھ فرق نہ آیا۔ پہلے چست آڑا پاجامہ پہنتے تھے۔ بیماری کے بعد سے غرارہ دار پہننے لگے تھے۔ لمبا پھنسی آستینوں کا کرتہ، سر پر سپید ٹوپی ایک ہاتھ میں پانوں کی ڈبیہ بٹوا، دوسرے میں مختلف اقسام کے سگار سگریٹوں کے ڈبے۔ آہستہ آہستہ سر جھکائے قدم سنبھالتے ٹہلتے ہوتے۔ مجھے آتا دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے ہاتے اُن کا باغ باغ ہونا! زبان سے مرحبا یا مبارک سلامت کچھ نہ کہتے۔ البتہ آنکھوں میں خوشی کی چمک ایسی ہوتی کہ مجھے اپنے قلب میں اُترتی معلوم ہوتی۔ لبوں پر مسکراہٹ اور باتوں میں شادمانی کی وہ گھلاوٹ کہ بیان سے باہر ہے۔ خوشی کا اظہار اپنے کسی ارادہ یا اشارہ تک سے نہ ہونے دیتے۔ لیکن سر سے پاؤں تک شگفتہ و زمزمہ سنج معلوم ہوتے۔

اُن کی باتیں تھوڑی بہت اب تک یاد ہیں۔ کہتے رشید صاحب سُنا۔ جب سے بیمار ہوا ہوں ذرا زیادہ عیاش ہو گیا ہوں۔ ہر طرح کے پان تمباکو فراہم رکھتا ہوں یہ دیکھئے۔ ہر فارکہ کا سگریٹ ہے۔ ہر ایک کا رنگ جدا ہے۔ ان میں وہی لطف آتا ہے جو مخصوص احباب کی صحبتوں میں آتا ہے۔ اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے مکان پہنچتے۔ نوکر کو آواز دیتے۔ ناشتہ لاؤ۔ فرماتے یہ لیجئے میں نے ہارلکس مالٹڈ ملک شروع کر دیا ہے۔ یہ اوولٹین کا گلاس ہے۔ یہ فورس ہے اور ہاں آپ نے کو ونٹر کے مکھن کھاتے ہیں۔ ذرا یہ پولسن بھی ملاحظہ فرمایئے۔ غرضیکہ ہر چیز بڑے شوق و لطف سے پیش کرتے پھر کہتے ناشتہ کر لیجئے۔ وہ بھی حاضر کیا جائیگا مدتوں سے باتنگ احتجاج دے رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا تھا دن قریب ہیں آج سے آپ دسترخوان پر چاروں شانے چت پائیں گے۔ یہ مرغ مسلّم کا عنوان تھا۔

اور یہاں یہ پان لکھنؤ کا ہے۔ آپ علی گڑھ کے پانوں کا پراپگینڈہ کرتے رہتے ہیں آج لکھنؤ اور بنارس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ برقی قوام ہے وہ زعفرانی پتی ہے اور یہاں رفوگر کو آواز دے کر ذرا وہ گولیاں منگوانا حکیم صاحب نے دی ہیں کہتے تھے ان کے مورث اعلےٰ نے شاہان اودھ کے لئے بڑے اہتمام سے اس کا نسخہ تیار کرایا تھا اس کا نام آبروئے اودھ ہے اسے ضرور چکھیئے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ لیکن اس سے علی گڑھ کی آبرو پر کیا اثر پڑے گا۔ کہنے لگے لیتے جایئے جس کی آبرو خطرے میں دیکھیئے گا دے دیجیئے گا۔

یہ سب کچھ تھا لیکن میں خوب سمجھتا تھا کہ یہ سارا اہتمام اور لطفِ بیان میرے لیا تھا۔ جو چیزیں اور جو باتیں مجھے پسند تھیں انہیں کو المضاعف کر کے اور خود اوڑھ کر پیش کر رہے تھے۔ اور اس لطف و نزاکت سے کہ مجھے ان کی اس حکمت عملی کو فاش کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ امرودوں کی فصل ہوتی تو اس کا ایک ٹوکرا ساتھ کر دیتے اور رو کنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے کبھی کہتے فلاں صاحب کو بھیجنے تھے معلوم ہوا کہ وہ آج کل موجود نہیں ہیں۔ زیادہ تو میں نے رکھ لئے۔ کچھ آپ لیتے جایئے۔ کبھی کہتے فلاں صاحب نے علی گڑھ میں فرمائش کی تھی تھوڑے سے انہیں بھی بھیج دیجیئے گا۔

ایک بار متعلقین وطن سے علی گڑھ آ رہے تھے۔ راستہ میں چند گھنٹوں کے لئے الٰہ آباد میں اصغر صاحب کے ہاں ٹھہر گئے۔ میرا سب سے چھوٹا بچہ احمد گود میں تھا۔ مرحوم کو بچے کی شکل اور وضع قطع ایسی پسند آئی کہ ٹھیک دوپہر میں اسے گود میں لئے سنبھلتے لڑکھڑاتے پیدل اپنے ایک عزیز دوست کے ہاں پہنچے۔ اصغر صاحب کو اس طرح آتے دیکھ کر ان کے دوست اور گھر والوں کو بہت تعجب ہوا۔ سب کے سب دوڑ پڑے۔ کیونکہ اصغر صاحب کو ڈاکٹر نے چارپائی پر مسلسل لیٹے رہنے کی تاکید کی تھی۔ غذا بھی کم کر دی تھی۔ ہفتوں بعد چارپائی

سے اٹھے تھے۔ اس لئے بہت نحیف ہو گئے تھے۔ بہتیرا لوگوں نے سمجھایا اور نوکروں نے مانگا۔ لیکن احمد کو اپنی گود سے نہ اتارا۔ تھوڑی دیر بعد بچے کو گود ہی میں لئے واپس ہوتے۔ شام تک اس کے ساتھ طرح طرح سے کھیلتے رہے حتیٰ کہ دودھ پینے کے لئے ماں تک جانے نہ دیا۔

کچھ دنوں بعد ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا تھا بولے رشید صاحب آپ تو دیکھئے ببّو (دوست کا بچہ) کتنا خوبصورت معصوم اور پیارا بچہ ہے آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ببّو سے مجھے کتنی اُلفت ہے اور اس کے والدین میرے کتنے سچے اور گہرے دوست ہیں۔ اس دن آپ کے متعلقین آتے تو میں نے احمد کو دیکھا آپ اندازہ نہیں کر سکتے اسے دیکھ کر میرے دل پر کیا اثر ہوا۔ اوّل تو میں بھول گیا کہ بیمار و نحیف ہوں۔ دوسرے دل میں ایک عجیب فخر آمیز جذبہ پیدا ہوا کہ احمد ببّو سے کہیں زیادہ دلکش اور پیارا ہے۔ ذرا میری بدحواسی تو دیکھئے میں نے ببّو کے والدین سے بھی کہہ دیا۔ کہ احمد نے ببّو کو زیر کر دیا۔ چنانچہ جس فاتحانہ انداز کے ساتھ میں گیا اس سے کہیں زیادہ فاتحانہ فخر و مباہات سے واپس آیا۔ احمد نے میری ایک کمی پوری کر دی۔

ایک بار خط آیا لکھا تھا "بلڈ پریشر اور احمد کی محبت دونوں بڑھ رہے ہیں۔ دیکھئے کیا انجام ہو"

مجھے اچھے گلابوں کا بڑا شوق ہے مرحوم اسے جانتے تھے۔ جب کبھی الہ آباد جاتا تو وہ پتہ لگاتے ہوتے کہ کہاں کہاں اچھے گلاب ہیں۔ اجنبی ہوتا تو اس سے رسم و راہ پیدا کرتے مجھے لے جاتے اور گلاب پسند کراتے۔ ایک بار ایسے ہی ایک جگہ مجھے لے گئے۔ مالک سے زیادہ خود ہر گلاب کی تعریف کرتے۔ گلاب یوں ہی سے تھے۔ میں نے اخلاقاً ایک آدھ کی ٹوٹی پھوٹی تعریف بھی کر دی۔ معاً اصغر صاحب نے اسے حاصل کرنے کے لئے ڈورے ڈالنے شروع کئے۔

میں نے موقع نکال کر چپکے سے کہہ دیا۔ اصغر صاحب فکر نہ کیجئے سب کے سب معمولی درجہ کے
ہیں۔ مرحوم کو غیر معمولی مایوسی ہوئی۔ واپسی میں میں نے پوچھا کہ یہ آپ چپ کیسے ہو گئے۔
کہنے لگے کیا کہوں ان گلابوں کے نادر ہونے اور اس شخص کے نامعقول ہونے کا بڑا شہرہ
سُنا تھا۔ گلابوں کے بارہ میں تو آپ نے فیصلہ کر دیا۔ نامعقول ہونے کا حال مجھ سے پوچھئے۔
کم بخت کسی طرح رام ہی نہ ہوتا . . . . صاحب (الہ آباد کے سب سے مقتدر
آدمی) کی معرفت اسے قابو میں کیا گیا۔ اس کے ساتھ میں نے وقتاً فوقتاً جتنا اخلاق برتا ہے۔
الہ آباد کا کوئی معقول و شریف آدمی برتنا گوارا نہ کرے گا۔ ٹھیک ہے ایسے مہمل آدمی کے گلاب
کیونکر عمدہ ہو سکتے ہیں! پھر خود ہی ہنس پڑے۔

مجھ میں ایک بدعادت یہ ہے کہ کہیں جاؤں علی گڑھ سے آخری گاڑی سے روانہ ہوں گا۔
اور کام ختم ہو جانے پر پہلی گاڑی سے واپس آجاؤں گا۔ مرحوم کی آخری علالت کے زمانہ میں میرا
جانا الہ آباد ہوا صبح پہنچا شام کی گاڑی سے واپس ہونا چاہا۔ مرحوم چاہتے تھے کہ میں رات میں وہیں
قیام کروں۔ ہزار ہزار طریقہ سے وقت ٹال دینے کی کوشش کرتے رہے۔ جب دیکھا کہ کام
نہیں چلتا تو اصرار کرنے لگے کہ تعطیل کا زمانہ ہے کوئی حرج نہ ہوگا۔ صبح چلے جائیے گا۔ میں ایسا
بدبخت کہ نہ مانا اور شام ہی کی گاڑی سے واپس چلا آیا۔
مجھے کیا خبر تھی یہ آخری ملاقات اور پہلا اور آخری ہی اصرار تھا۔ میرے انکار پر ایسا معلوم
ہوا جیسے مرحوم کے چہرے پر یخ پڑگئی لیکن میں کیا بتاؤں کس ضبط و بامردی اور کس مرحمت سے
بابا تو پھر آپ کی خوشی۔ وہ سماں اب بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے تو مجھے اپنی اوقات
پر حسرت ہو جاتی ہے۔ اور اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں اس واقعہ کا تذکرہ نہ کرتا لیکن

مرحوم کو میں نے جس طور پر اور جس حالت میں شکستہ خاطر کیا تھا اس کی پاداش میں اپنی اس شقاوت کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں۔ اس اعلان و اعتراف سے کبھی کبھی امید بندھتی ہے کہ شاید اپنے نفس کی ملامت اور دوسروں کی لعنت کا ہدف بن کر کبھی اور کہیں اصغر صاحب مرحوم کی روح کا سامنا کرنے کی ہمت ہو سکے۔

دو ہی ایک روز کے اندر تار آیا کہ اصغر صاحب نے رحلت فرمائی۔

دوسرے دن میں الہ آباد پہنچا۔ بلو پڈیر کا راستہ سونا تھا۔ طبیعت بے اختیار ہو گئی۔ خلوص و محبت و مروت کا وہ پیکر مجسم ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زندگی کی بڑی مضبوط طناب ٹوٹ گئی۔ زندگی جو عبارت تھی دوست کی محبت و شیفتگی سے اس میں خلا پیدا ہو گیا۔ ایسا خلا جس میں بیابانی برفستانی ہواؤں اور گورستانی سناٹوں کے کچھ اور نہ تھا۔ اب ہمہ تن شوق ہو کر میرا کون انتظار کرے گا۔ میری تحریروں پر کس کو وجد آئے گا۔ اور کون اسے مسرت و فخر سے لوگوں کو دکھاتا سناتا پھرے گا۔ میرا کوئی مضمون شائع ہوتا تب سے پہلے اصغر صاحب کا ستائشی خط آتا۔ اصغر صاحب کی رحلت نے مضمون لکھنے کا ولولہ بڑی حد تک سرد کر دیا۔ میرے اچھے یا برے خیالات کا بیشتر حصہ مضمون لکھنے کے دوران میں مجھے نشان و گمان معلوم نہیں کیوں اور کس طرح آتا ہے۔ جب کوئی اچھا خیال یا فقرہ ذہن میں آتا تو اس کی خوشی ہوتی کہ اصغر صاحب اس کی داد دیں گے۔ اور لکھو بہتر لکھو اور جلد لکھو کی امنگ پیدا ہوتی۔ اب وہ بات نہیں بعض باتیں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طور پر قلم سے ایسی بھی نکل جاتی ہیں۔ جن کے بارہ میں مجھے خود اندیشہ رہتا ہے کہ شاید اس کی تہ تک لوگ نہ پہنچیں یا پہنچنا گوارا نہ کریں۔ اصغر صاحب ہمیشہ اسے پا جاتے داد دیتے اور ملاقات

ہوتی تو سب سے پہلے اسی پر گفتگو کرتے۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ میں کوئی بڑا صاحب فکر ہوں یا لوگ میری بات نہیں سمجھتے تو کسی نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ہرگز نہیں شخصی تجربات یا تاثرات کے لئے غیر معمولی فراست یا علمیت لازمی نہیں ہے۔ یہ تو ہر شخص کے بھید ہوتے ہیں جن سے وہ خود ہی زیادہ واقف ہوتا ہے۔ میرا یہاں مطلب صرف اس شیفتگی سے ہے جو میرے باریک سے باریک اور نازک سے نازک تاثرات و تصورات اسی مرحوم کو تھی۔ اور جن کے خفیف سے خفیف ارتعاش بھی ان کے ذہن و دماغ پر مرتسم ہو جاتے۔

فالج کے حملہ کے بعد سے ڈاکٹروں نے ان پر بہت سی پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ جن پر وہ محض اس وجہ سے عامل رہتے تھے کہ ڈاکٹر کا یہی حکم تھا۔ ورنہ وہ مرض کے انجام سے ڈرتے نہ تھے۔ غذا یا رہنے سہنے کے سلسلے میں جو پرہیز بتایا گیا تھا۔ اس میں عجیب لطافتیں پیدا کر لی تھیں۔ خون کا دباؤ بے حد تھا لیکن وہ قریب قریب بھلے چنگوں کی طرح رہتے تھے۔ ایک بار ڈاکٹر نے کہا خون کے اس دباؤ کے ہوتے ہوئے آپ کا زندہ رہنا بھی کرامات میں سے ہے۔ اصغر صاحب نے کہا بہت ممکن ہے موت اسی سے واقع ہو لیکن زندہ رہنے کے اور ہی گر ہیں زندہ رہنے میں ارادہ کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ ہوش میں رہ کر تو میں مروں گا نہیں۔ البتہ بے خبری میں آپ کا بس چلے تو موت سے نپٹ لیجیے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مرحوم رات کے کھانے پر دوستوں میں سے کسی کے ہاں مدعو تھے۔ سب لوگ ہنس بول رہے تھے کہ فالج کا شدید حملہ اور یک لخت حملہ ہوا۔ اور چند گھنٹے مطلق بے خبری کے عالم میں رہ کر ہمیشگی میں مل گئے۔

اصغر صاحب زندگی کے ہر نشیب و فراز سے گزرے تھے۔ ہر قسم کی صحبتیں دیکھی تھیں۔ لیکن انہوں نے خودداری اور بانکپن کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ دیا۔ جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں ان کا شاعر ہونا اتفاقی تھا وہ کچھ اور ہوتے تو بھی یہی رنگ قائم رہتا۔ ان کی وفات کے بعد مجھے ان کے بہت سے ملنے والوں سے سابقہ ہوا۔ اوباش، قلندر، ارباب علم و فن، صاحب باطن، ارباب ودل بکواسی و بے بہرہ، طالب علم، کاروباری لوگ میں نے ہر ایک کو ان کو قائل پایا۔ ان کے دشمن بھی کم نہ تھے جنہوں نے مخالفت میں وہ سب کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ لیکن اصغر صاحب کو گھٹیا کسی نے نہیں بتایا۔

اصغر صاحب کے جاننے پہچاننے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے۔ جو بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے۔ جن کی قابلیت اور شخصیت مسلّم ہے وہ بھی اصغر صاحب کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ مرحوم میں وہ بات نہ تھی جو ساحروں یا فاتحوں میں ہوتی ہے کہ ان کے سامنے رہئے تو سب کچھ بعد میں کچھ نہیں مرحوم تسخیر نہیں کرتے تھے بلکہ لوگ خود ان کی الفت و اخلاص کی منزلت کرنا عزیز رکھتے تھے۔

ان میں ایک خاص نوعیت کی بڑائی تھی۔ جس کا ہر بڑائی کو لحاظ رکھنا پڑتا تھا!
جامعہ ملیہ میں ایک بار مشاعرہ تھا شعر خوانی اور شعر سرائی ہو رہی تھی۔ اصغر صاحب کی باری آئی مرحوم کی آواز ذرا پست تھی۔ شعر پڑھنے شروع کئے تو مجمع میں انتشار پیدا ہوا۔ مرشد (ذاکر صاحب) پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ یک بیک اصغر صاحب سے پرچہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور شعر سنانے شروع کر دئیے۔ ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔

زلا تسخیر کردم ایں جہانے مہر و انجم را
زجوشش بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا

میں جانتا ہوں مرشد کا یہ اضطراری فعل کس راز کی غمازی کر رہا تھا اور مرشد کے اضطراری فعل کا کیا درجہ ہوتا ہے ان کے چند ہی اضطراری آنسوؤں نے علی گڑھ کی آبرو رکھ لی۔ اور جامعہ کو جامعہ بنا دیا اور مسلمانوں میں ایک نژاد نو کی طرح ڈالی۔

اصغر صاحب مشاعروں سے بیزار تھے لیکن کہا کرتے تھے کہ طالب علموں کی دعوت رد کرنا گناہ ہے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ ان میں بے راہ روی ضرور پیدا ہو گئی ہے لیکن یہ قصور ہمارا ہے ہم میں نظر و فکر کی وہ گہرائی اور وسعت باقی نہیں رہی جو سفینہ نو کی متحمل ہو سکے۔

جگر صاحب سے ان کے خاص تعلقات تھے۔ وہ ان کی بے راہ روی سے بڑھے کڑھتے تھے لیکن ان سے محبت کرتے تھے۔ جگر صاحب انتہائی خود فراموشی کے عالم میں بھی اصغر صاحب کا بڑا پاس کرتے تھے مرحوم اکثر جگر صاحب سے کہتے تھے کہ جو چاہو کر لو آنا تم کو یہیں پڑے گا۔ جگر صاحب ایسے غیور عزت پسند قانع اور سادہ مزاج شاعر کم دیکھنے میں آتے جن کو وہ اپنے نزدیک بزرگ یا بہتر سمجھتے ہیں۔ اس کا لحاظ اس طرح کرتے ہیں جیسے پرانے زمانہ میں چھوٹے اپنے بڑوں کا کرتے تھے۔ بایں ہمہ جگر صاحب البیا منہ پھٹ آدمی بھی کم ملے گا۔ جاہ و شہرت سے مرعوب ہونا جانتے ہی نہیں۔ اپنی اس افتاد طبع سے بعض مواقع پر عجیب عجیب نزاکتیں پیدا کر دیں۔ اب تو خدا کے فضل سے مدتوں سے عالم ہوش میں ہیں اور پچھلی عادت یک قلم ترک کر دی ہے۔ میں نے ان کو انتہائی از خود رفتگی کے عالم میں دیکھا ہے۔ اور بڑے سے بڑے شاعر اور شخصیت کو سخت سست کہتے سنا لیکن اصغر صاحب نام آتے ہی ان کو یا تو سناٹے میں آتے دیکھا یا بے اختیار اشکبار پایا۔ اور جگر صاحب کا اب تو یہ عالم ہے کہ وہ اصغر صاحب کے مخصوص انداز و اطوار میں اپنے کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنی بعض بعض باتوں کو اصغر صاحب کے باطنی تصرف کا صدقہ سمجھتے ہیں اور اس پر خوش

ہوتے اور فخر کرتے ہیں۔

اصغر صاحب کے کلام پر ان کی زندگی ہی میں بعض ناقدین نے سخت نکتہ چینیاں کیں۔ مرحوم کی نظر سے یہ سارے مضامین گزرتے تھے لیکن میں نے آج تک ان کی زبان سے ناقدوں کو بُرا بھلا کہتے نہ سُنا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ ناقدوں کا درجہ بہت بلند ہے بشرطیکہ وہ مخلص اور سمجھدار ہوں۔ غلط کا مفسر شاعر ہے اور شاعر کا مفسر نقاد ہوتا ہے۔ یہ کڑیاں اُٹھ جائیں تو دنیا اختلال محض ہو کر رہ جائے۔ ایک دفعہ انہوں نے فرمایا تھا کہ لوگ اپنی افتادِ طبع کا اجتناب کئے بغیر غزل یا غزل گو سے برہم ہونے لگتے ہیں۔ لوگ غزل سے بیزار ہیں۔ اس لئے کہ اس کے موضوع کو پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ اب غزل کا موضوع ہی نہیں بلکہ اس کا رنگ و آہنگ بھی بہت کچھ بدل گیا ہے۔ یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ بُرے غزل گویوں نے کیا خرابیاں پھیلائیں۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ اچھے غزل گو کتنی خوبیاں پیدا کر سکتے ہیں اور پھیلا سکتے ہیں۔

مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ میں غزل کو مدِ نظر رکھ کر شعر نہیں کہتا اس کو کیا کروں کہ بلند گہرے نازک اور لطیف خیالات خود بخود غزل کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔ کاش میرے خیالات واحساسات کوئی دوسرا پیکر اختیار کر لیتے۔ مجھے قطعاً افسوس نہ ہوگا اگر وہ غزل نہ کہلائیں۔

ایک دفعہ میں نے عرض کیا اصغر صاحب آپ تو جتنے اور جیسے شعر چاہیں کہہ سکتے ہیں ایسا کیوں نہیں کرتے کہ غزل میں صرف اوّل درجے کے اشعار تو رہنے دیا کیجئے بقیہ کو حذف کر دیا کیجئے۔ اصغر صاحب پر ایک جھرجھری سی طاری ہوئی پہلو بدل کر بیٹھ گئے۔ فرمایا رشید صاحب یہ آپ نے کیا بات کہی؟ آپ ایسی باتیں کرتے ہیں! شاعر کبھی دوسرے درجہ کی بات کہتا ہے؟ کہہ بھی سکتا ہے؟ وہ تو ہمیشہ اوّل ہی درجہ کے شعر کہتا ہے۔ سننے والے کے نزدیک وہ اوّل درجہ

کا ہو یا دوم درجہ کا۔ اس سے شاعر کو کیا علاقہ! آپ کے نزدیک وہ چھوٹی ہو تو ہو جب شاعر نے اسے کہہ دیا تو وہ بڑی ہو گئی۔ بہت بڑی کچھ دن اور گزریں تو یہ حقیقت آپ پر خود واضح ہو جائے گی۔

اصغر صاحب کو سجاد انصاری مرحوم سے بڑا لگاؤ تھا۔ کہتے تھے زندگی نے وفا نہ کی ورنہ خدا جانے کیا ہوتے۔ فرمایا ہم میں ایسے نقاد اور مفکر کی بڑی ضرورت ہے کیونکہ اردو میں خرافات نگاروں کی تعداد بہت جلد بڑھ جاتی ہے۔ جن کا تدارک نہ کیا جائے تو ہونہاروں پر زندگی تنگ ہو جائے۔ بڑے بت شکن تھے کچھ دن اور جیتے ہوتے تو کیا معلوم توفیق الٰہی انہیں براہیم بنا دیتی۔ سر سید کا بڑا احترام کرتے تھے۔ کہتے تھے سر سید کا احترام کرنے میں لطف آتا ہے اس لئے کہ وہ احترام کی حرمت سے واقف ہیں۔ باتوں باتوں میں ایک دن فرمانے لگے کہ ان کی صحبت میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی حال میں نہ اپنی سطح سے اتریں گے نہ حاضرین میں سے کسی کو اس کی حدود سے گزرنے دیں گے اردو ہندی کے سلسلہ میں کہنے لگے کہ ہندوستان میں سر سپرو اور پنڈت کیفی ہی ایسے ہندو ہیں۔ جن کو اردو سے بربنائے اردو الفت ہے۔ دونوں میں پرانے زمانہ کے مسلمان شرفا جیسی وضع داری ملتی ہے۔

اونچی جماعتوں کے مختلف الخیال طلباء اکثر ان کی صحبت میں دیکھے گئے۔ تعجب ہوتا کہ یہ نوجوان جدید ترین افکار کے حامل ہوتے ہوئے بھی کس طرح اصغر صاحب کا کلمہ پڑھتے ہیں میں نے مرحوم سے ایک دفعہ اس کی وجہ پوچھی بولے دنیا میں ایک ہی مستقل علم تو ہے نہیں ہر علم کے تار و پود ایک دوسرے میں ملے ہوتے ہیں۔ ایک ہی علم کی تکمیل مختلف علوم یعنی مختلف معلموں سے ہوتی ہے۔ پھر آپ تو جانتے ہیں کتابی اور اخباری علم (مسلکاً) ابزرگوں کے تصرف" کا ہمیشہ محتاج رہے گا۔ جب علم ارزاں اور معلم نایاب ہوں تو ظاہر ہے ہم آپ نظر انداز نہیں

کہتے جا سکتے۔

اصغر صاحب مرحوم کے کلام پر گفتگو کرنے کا یہ محل نہیں لیکن میری مشکل یہ ہے کہ ان کے کلام کو ان کی زندگی سے علیحدہ بھی نہیں کر سکتا۔ مرحوم کا ذکر چھیڑتا ہوں تو بار بار ان کا کلام سامنے آتا ہے۔ اور ان کے کلام کی طرف رجوع ہوتا ہوں تو اصغر صاحب جیتے جاگتے مسکراتے سامنے آموجود ہوتے ہیں ان کے کلام کو جسم و جان میں منتقل کیجئے تو اصغر صاحب اور اصغر صاحب کو الفاظ و عبارت میں تحویل کیجئے تو ان کا کلام!

کلام سامنے آجانے سے مقصد ان کے اشعار کا یاد آنا نہیں ہے۔ بلکہ وہ جمال و کمال اور تصورات کی وہ مینا کاری و فردوس آرائی ہے جسے ان کا کلام بروئے کار لاتا ہے۔ ان کا کلام انہیں کی طرح محبت کرنے والا، رفاقت کرنے والا اور ترفع پیدا کرنے والا ہے۔ اصغر آپ کو فکر کی زحمت نہیں دیتے۔ یہ زحمت وہ خود اٹھاتے ہیں وہ اپنے فکر کے رنگین و رعنا نقوش سے آپ کی مدارات کرتے ہیں اور مدارات بھی اس طرح کرتے ہیں کہ آپ پر کسی قسم کا بار نہیں ہوتا۔ یہی بات اصغر صاحب کی زندگی میں ملتی تھی۔

اس سلسلہ میں محض افہام تفہیم کی خاطر میں ضمناً اقبال کا بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔ اقبال کے کلام کا مطالعہ کیجئے معاً طائی کے کوہ ندا کی مانند وہ اپنی پہلی آواز پر آپ کو کشاں کشاں اپنے قدموں میں لا ڈالیں گے۔ اور آپ سے کچھ بن نہ پڑے گا۔ اصغر سے رجوع کیجئے وہ آپ کے ساتھ ہو لیں گے اقبال آپ کو سر مو ادھر ادھر نہ ہونے دیں گے۔ اصغر سے آپ خود علیحدہ نہ ہوں گے۔ اقبال کے ہاں (شعور فکر تعمیم) اور دعوت عمل ہے۔ اصغر کے ہاں تصورات جمیل اور دعوت دید۔ اقبال حکومت کرتے ہیں اور اصغر رفاقت کرتے ہیں۔ معنوی حیثیت سے دونوں جدا ہیں اور اپنی اپنی وادی کے امام ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور ان کے در و بست کے اہتمام (ترصیع) میں دونوں انتہائی احتیاط اور صناعت کاری

کو دخل دیتے ہیں اور سلیقہ و شرافت کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔

اصغر کی زندگی بھی سلیقہ، شرافت اور صداقت میں گزری۔ ظاہر ہے یہی رنگ ان کے کلام کا بھی ہوگا۔ اصغر سرتاسر غزل گو ہیں لیکن ان کے کلام میں غزل کی مروجہ یا مسلمہ عریانی یا ہنرکاری نہ ملے گی۔ آپ ان کا کلام بے تکلف جس کے سامنے چاہیں پڑھ سکتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے الفاظ اور جذبات کو پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے اور دونوں کو انتہائی احتیاط اور سلیقہ سے اپنے کلام میں برتا ہے۔ ان کے ہاں ترغیبات یا تجربات جنسی نہ ملیں گے۔ بلکہ ان کی لطافتیں اور نزاکتیں، ان کی رفعتیں اور ان کی ذمہ داریاں۔ ان کے ہاں تفصیل نہیں تحلیل ہے۔ کیمیائی یا تقسیماتی تحلیل نہیں بلکہ شاعرانہ اور عارفانہ تحلیل۔ پھر وہ اس تحلیل کو الفاظ و معنی کیف و کم رنگ و آہنگ کے ایسے فانوس میں گردش دیتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے اپنے محبوب کا خد و خال نظر آتا ہے۔ عارفانہ تعبیر اور شاعرانہ صناعت کاری کا معجزہ بھی یہی ہے۔

اصغر عوام کے شاعر نہیں ہیں ان کے کلام کے حسن و تاثیر سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آپ تھوڑے بہت لکھے پڑھے بھلے مانسوں میں بیٹھے اور ذوق و بصیرت رکھتے ہوں۔ شاعری نہیں بلکہ دنیا کا ہر شریف فن ریاض اور رکھ رکھاؤ چاہتا ہے۔ اصغر صاحب کی شاعری اسی کا نمونہ ہے اگر جدید اسکول اسے پسند نہیں کرتا تو یہ اصغر صاحب کا قصور نہیں ہے۔ قصور اس مقصد اور معیار کا ہے۔ جس کے واضع نہ مقلد نہ مداح!

---

۷ اصغر صاحب اپنے کلام کی جنت میں ہمیشہ زندہ قائم رہیں گے!

ایوبؔ

تمہاری نیکیاں زندہ تمہاری خوبیاں باقی

ایوبؔ مرحوم کے بارے میں کیا کہوں کیونکر کہوں اور کہاں سے شروع کروں وہ اتنے اچھے تھے اور اتنے ناگزیر تھے کہ ان کے بارے میں کچھ کہنا شروع کروں تو سب سے پہلے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ نہیں وہ۔ یہاں سے نہیں وہاں سے۔ ابھی نہیں آگے چل کر۔ یوں نہیں وہ ں۔

وہ موجود تھے تو ان کی مثال نعائم فطرت کی تھی۔ مثلاً ہوا پانی۔ روشنی جو اس درجہ عام دارزاں ہیں کہ ان کی طرف توجہ مائل نہیں ہوتی۔ لیکن ان میں سے کسی میں کہیں سے کوئی فرق آجائے تو پھر دیکھئے کیسی کیسی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور یہی ناقابل التفات نعمتیں کیسی نعمتیں بن جاتی ہیں۔

ایوب ایسے ہی تھے وہ دوستوں کی زندگی میں اس طرح اور اس درجہ گھل مل گئے تھے کہ ہم

سے رخصت ہوگئے تو ہم میں سے ہر ایک نے یہ محسوس کیا کہ جو چیز ناقابل التفات حد تک ارزاں و عام تھی۔ وہی ناقابل بیان حد تک اچھی ضروری اور نایاب بھی تھی۔

ہم سب کی زندگیوں میں مرحوم کے گھل مل جانے کا راز یہ تھا کہ ان میں بظاہر کوئی بات غیر معمولی نہ تھی۔ وہ غیر معمولی قابلیت کے آدمی نہ تھے۔ دولت مند نہ تھے۔ کچھ بہت ذہین بھی نہ تھے۔ نہ انہیں توڑ جوڑ آتا تھا۔ نہ خوش پوشاک۔ نہ خوش گفتار۔ نہ خوش باش۔ نہ رنگین و رعنا۔ وہ معمولی آدمیوں سے بھی زیادہ معمولی تھے۔ پھر بھی وہ ایسے تھے کہ اب ہم میں ویسا کوئی نہیں اور نہ اب ڈھونڈھے سے بھی کوئی ایسا ملے؛

سیاہ فام، چیچک رو، پست قد، نحیف الجثہ۔ پہلے پہل کوئی دیکھے تو منہ پھیر لے۔ برتے تو غلام بن جائے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ لئیق کی خوبیوں نے ان کی بدصورتی کو کس درجہ دل آویز بنا دیا تھا۔ فطرت اپنی چوک کی بسا اوقات کسی بے دریغ بخشش سے تلافی کرتی ہے کہ میری ہی نہیں۔ میرے عزیزوں اور دوستوں کی بھی ان سے بڑی پرانی ملاقات چلی آتی تھی۔ اور میں نہیں بتا سکتا کہ کہ ہم سب کی زندگی میں لئیق کس قدر دخیل تھے اور ان کی موت نے ہم سب کو کیسا بیقرار و مایوس کس درجہ بے دست و پا کر دیا۔ وہ میرے ہی دیار کے تھے اور ایک بڑے ہی مستند شریف۔ ذی علم اور صاحب خیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ میں علی گڑھ میں تھرڈ ایر میں تھا جب لئیق فرسٹ ایر میں داخل ہوئے۔ بی اے ایل ایل بی ہو کر پوسٹ آفس میں ملازمت کر لی۔ اور علی گڑھ ہی میں رہ بس گئے۔

اسکول کی تعلیم کے دوران میں وہ میرے عزیزوں و خوردوں کے ہم سبق تھے۔ علی گڑھ میں آئے تو ہم سب ایک ہو گئے۔ اور سترہ اٹھارہ سال تک ہر رنج و راحت میں ایک دوسرے کے شریک رہے۔ یہ تو تھے میرے ذاتی تعلقات۔ اسی قسم اور اسی درجہ کے تعلقات مرحوم کا اوروں

سے بھی تھے اور سب جانتے ہیں کہ ان کی جدائی کا جو الم مجھے ہے اس سے کم دوسروں کو نہیں ہے ، خدا ہی بہتر جانتا ہے ۔ اس پیکرِ صفیر میں دل سوزی و خود سپاری کا کیسا بیکراں و بیش قیمت خزانہ ودیعت تھا۔

مجھ پر، میرے بچوں پر، میرے دوستوں پر اور میرے خاندان پر جان چھڑکتے تھے۔ خوشی کی بات ہو تو ایوب صاحب سب سے پہلے موجود اور سب سے زیادہ خوش۔ رنج و تردد کا موقع ہو تو سب سے پہلے حاضر بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے یا ہر شخص کی خوشامد کر رہے ہیں۔ خوشی میں ہر طرح کے جملے فقرے سرگرمی ہیں ۔ اور اپنی مسرت کا طرح طرح سے اظہار کر رہے ہیں۔ رنج و مایوسی کا موقع ہو تو ایک حرف زبان پر نہیں نہ تسکین کا نہ تقویت کا۔ چپ چاپ بیٹھے سراپا کا جائزہ لے رہے ہیں ۔ یا محبت و ہمدردی سے بے اختیار ہو ہو کر سسک رہے ہیں۔ ذرا بھی احتمال ہوا کہ کسی کا آنا یا کسی معاملہ میں میرا دخل میرے لئے تکلیف دہ ہوگا۔ تو اسے پہلے ہی سے بھانپ کر کسی نہ کسی طرح اس کا سدِّباب کر دینا اور اس طرح کرنا کہ مجھے اب تک کانوں کان خبر نہ ہو۔

میں اور میرے دوستوں کا یہ حال تھا کہ ہاتھ پاؤں ہلانا نہ ہو۔ اور ایوب سب کام کر دیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی تھیں جن کی تمام تر ذمہ داری ہمیں پر ہوتی تھی۔ لیکن اس سے بذاتِ خود عہدہ برآ ہونے کے بجائے یا اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو تو ہم سب ایوب صاحب ہی پر بگڑتے تھے ۔ اور بہانے نکال نکال کر انہیں سخت سُست کہتے تھے ایوب صاحب معمولی بلگجی شیروانی پہنے ۔ ٹوٹا پھوٹا جوتا ۔ میلا سا مفلر گلے میں لپیٹے جلدی جلدی آ رہے ہیں۔ ہائے ان کا وہ چھوٹا سا قد بمشکل سے پانچ فٹ کا مشغول و منہمک مفلر جلد جلد کھولتے لپیٹتے راستہ میں ہر ایک سے کچھ کہتے کچھ سُنتے ۔ گرتے پڑتے چلے آ رہے ہیں۔ ابھی

فاصلہ ہی پر ہیں کہ جس شخص کے پاس آ رہے ہیں اس نے صلواتیں سنانی شروع کر دیں۔ آپ پہنچے تو سخت سست کی بوچھاڑ۔ ایوب صاحب ہیں کہ نادم ہیں۔ ہنستے جا رہے ہیں۔ معذرت کر رہے ہیں۔ دو چار صلواتیں خود بھی سُنا دیں۔ غرض دو چار منٹ کے بعد اطمینان ہوا تو ٹھکانے کی باتیں ہونے لگیں۔ وعدہ کیا کہ کام کر دیں گے نہ کریں تو جو چاہے کر ڈالئے۔ چلنے لگے تو پھر کام کی تاکید کی گئی۔ پان سات صلواتیں سُنا دی گئیں اور اتنی ہی سُن لی گئیں۔

ایوب صاحب کا گھر بارہ مہینے تھرڈ کلاس کا مسافر خانہ بنا رہتا تھا۔ ہر طرح کے لوگ ٹھہرے ہوتے ہیں۔ بالخصوص اعزا اور دوستوں کے لڑکے مجھے یقین ہے اور میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ایوب صاحب کے گھر میں قیام کر کے ان کے خرچ سے ان کی توجہ و محنت سے اور ان کے بل پر اعزا اور احباب کے جتنے لڑکوں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی ہو گی۔ اتنا اب تک کسی اور شخص سے نہ اب تک ہوا اور نہ شاید آئندہ ہو۔

ان کے گھر میں طالب علموں کا وہ ہجوم کہ اندر جا کر دم گھٹنے لگتا تھا۔ ہر شخص کو کھانا پلانا سامان دینا۔ ان کی ضرورتوں کو نظر میں رکھنا اور ان کی فکر کرنا۔ اس کے بعد آفس کا کام۔ دوستوں کا کام۔ غرض اس شخص کی مشغولیتیں دیکھ کر ہم سب تعجب کیا کرتے تھے کہ یہ شخص زندہ کیسے ہے اور اس کے حواس کیونکر بجا ہیں۔

اس کا اندازہ آپ یوں کر سکتے ہیں کہ ایوب صاحب نے شاید ہی کبھی اپنے گھر کھانا کھایا ہو۔ یاد ورد مسلسل اپنے گھر سوتے ہوں جہاں مل گیا وہیں کھا لیا اور ہو سکا تو وہیں رات بھر کے لئے پڑ رہے۔ چارپائی بستر میسر آتے یا نہ آتے۔ آرام کرسی پر سو رہے۔ میز پر لیٹ گئے ورنہ کچھ لپیٹ کر فرش پر ہی ایک طرف سکڑ سکڑا کر رات بسر کر دی۔ مشکل سے ایک آدھ چپاتی اور تھوڑا سا سالن کھاتے تھے۔ اتنا کم کھانے والا بھی شاید ہی کہیں ملے۔ کبھی کبھی ایک آدھ پیالی چائے

پر ہی اکتفا کر لیتے تھے۔

سگرٹ اور حقہ کے زیادہ شائق تھے۔ بیڑی سگرٹ۔ سگار۔ حقہ جو مل جاتے ان کے لئے کفایت کرتا تھا۔ دوستوں میں سے کوئی بیمار پڑا اور یہ آموجود ہوتے۔ رات دن کا مسلسل قیام۔ پاؤں دبا رہے ہیں۔ دوا لا رہے ہیں۔ کھانا تیار کر رہے ہیں۔ اور بقول ہم یورپ والوں کے اس کا گو موت کر رہے ہیں۔ بیماری میں آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے چنانچہ اس کی ہر قسم کی زیادتیاں بھی سہہ رہے ہیں۔ بیمار اچھا ہوا تو شکریہ میں بھی سخت سست ہی کلمات کہے۔ ایوب صاحب ہیں کہ خوش ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ایوب صاحب کو جو لوگ صلواتیں سناتے تھے وہ سب ایوب صاحب کے گرویدۂ احسان ہو کر شعرا اور بے فکروں نے لطف و تشکر کے جتنے الفاظ وضع کئے ہیں وہ سب اُن گالیوں کے سامنے ہیچ تھے جو ہم سب ایوب کو دیتے تھے اور ان سے سنتے تھے۔

ایک دفعہ بیوی اور بچے مکان گئے ہیں اور دو بچیاں رہ گئیں۔ باورچی یک بیک چلا گیا برسات کا موسم تھا۔ میں دن بھر ادھر ادھر مارا مارا پھرا تھا۔ کوئی ۵-۶ بجے شام گھر واپس ہوا۔ دیکھا تو ہر چیز قرینہ سے مکان میں لگی ہوئی ہے۔ بچیاں صحن میں آم کھا رہی ہیں۔ ذرا ہی دیر میں ایوب صاحب آنکھ ملتے۔ راکھ میں لت پت باورچی خانے سے ڈانٹ کر بولے جی کچھرے اٹھاتے لکڑیاں بھیگی ہوئی ہیں۔ چولہا ٹوٹا ہوا ہے۔ میں نے کہا کیا ہوا (کچھ سخت و سست الفاظ کے بعد) آخر ڈائننگ ہال کو کیا ہوا تھا۔ وہیں سے انتظام کر لیا ہوتا۔ بولے۔ جی شام کے ۵-۶ بجے آپ کے لئے ڈائننگ ہال سے باقر خانیاں نہ آجاتیں۔ بچیاں کیا کرتیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آفس سے براہ راست شہر گئے وہاں سے بچیوں کے لئے آم اور پکانے کے لئے کچھ ساگ ترکاری لائے۔ بچیوں کو آم میں پھنسا کر خود باورچی خانہ میں پل پڑے۔ ترکاری ساگ اور کچھ اسی قسم کی چیزوں سے الجھے ہوتے تھے۔ میں نے کہا۔ بھئی ایوب خدا کے لئے کچھ تو ڈھکانے کی

چیز کھا پی لیا کرو۔ ورنہ آنکھیں بھیک مانگنے لگیں گی۔ بولے جناب نے بھی تو ملغجن ہی کھا کھا کر عینک کے نمبر بڑھاتے ہیں!

کھانا پینا ہو چکا تو آم نکالے۔ میرے سامنے تو قلمی اور لنگڑے رکھے اور خود چوسنے والے آم لئے۔ میں نے کہا یہ کیا۔ یہ آم کیوں نہیں لیتے۔ کہنے لگے یہ آپ ہی کو مبارک ہوں۔ مجھے تو چوسنے والے ہی پسند ہیں۔ میں نے کہا چوسنے والے اپنے گھر کھا یئے گا۔ میرے ہاں اس قسم کی قومی حرکت کرو گے تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں۔ کھانا پینا ختم ہوا تو اپنی کھری چارپائی بچھوں کی چارپائی کے درمیان بچھا کر لیٹ رہے۔ اور ان سے انہیں کے دل پسپی کی ادھر اُدھر کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ جب وہ سو گئیں تو سر سے پاؤں تک کمبل تان کر خاموش ہو گئے۔ میں نے دیکھا تو کہا آؤ اب تم اس گھر سے نکلو۔ اس بڑی گرمی میں کمبل اوڑھ کر برآمدہ میں سو گئے تو ظاہر ہے تمام رات میں صحن کے اس چبوترہ پر رقص کروں گا۔ کیا فائدہ صبح میں پاگل خانہ بھیجا یا جاؤں اور تم قبرستان نہ جانے اور رات اسی طرح سوتے۔ ان کا یہی معمول تھا۔

صبح جیتے جاگتے اُٹھ بیٹھے اور دن کے دھندے میں لگ گئے۔ علی گڑھ میں داخلہ کا زمانہ بڑے ہنگامے کا ہوتا ہے۔ سارے بزرگانِ قوم جو سال بھر ہم سب کو گالی اور اخبارات کو پیام بھیجتے رہتے ہیں۔ نئے سیشن کے شروع ہونے ہی ہم کو فرونِ اولیٰ کا مسلمان قرار دے دیتے ہیں پہلے خطوط آنے شروع ہوں گے۔ اس کے بعد تار اس کے بعد تانگے "خلاصہ فریاد" ایک ہی ہوتی ہے۔ یعنی لڑکا آپ کا ہے۔ یونیورسٹی قوم کی ہے۔ اور حکومت ہندوؤں کی۔ لڑکے کو داخل کرا یئے۔ جتنی مراعات ہو سکیں دلوا یئے۔ بقیہ خود پوری کیجئے۔ چال چلن اور زندگی کی نگرانی کیجئے۔ پاس کرا یئے۔ نوکری دلوا یئے اور ہم دونوں کو اس وقت تک مہمان رکھئے۔ جب تک کہ لڑکا یہاں کے ماحول سے آشنا اور خود اُن سے متنفر نہ ہو جائے۔ حج اور بتر تھ

کے بارہ میں تو یہ طریقہ ہے کہ ملک کے مختلف حلقے مطوف اور پنڈتوں نے بانٹ لئے ہیں۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں یہ آپ کی جان ومال کے ذمہ دار اخلاقی فوجدار ہیں۔ جان کے کم۔ مال کے زیادہ۔ علی گڑھ کا دستور اس سے بالکل مختلف ہے۔ جس کا جی چاہے جس جس مطوف یا پنڈے کے ہاں ٹھہر جائے۔ اور اس کی جان ومال کا انچارج بن جائے۔ داخلہ کا زمانہ عین برسات کا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے برسات مہمانداری۔ اور قوم کی مرثیہ خوانی کا بیک وقت زور ہو۔ اور کام کوئی نہ ہو تو معدہ کب تک ساتھ دے گا۔ والدین[1] میں سے کوئی پیچش میں مبتلا ہے۔ کوئی اسہال میں کسی کو یونانی علاج موافق نہیں آتا۔ کسی کو ڈاکٹری دوا سے اصولاً اختلاف ہے۔ کھانا ناشتہ سب کو موافق حکیم صاحب کے ہاں لے جاتے یا انہیں بلاتے تو بتائیں گے۔ موجودہ شکایت اور علاج کرائیں گی دیرینہ شکایات کا!

---

[1] یہ لفظ لغوی معنوں میں نہیں استعمال ہوا ہے۔ یہ علی گڑھ میں ترک موالات کے زمانہ کی یادگار ہے۔ جب ہر لڑکے کا کوئی نہ کوئی بزرگ اپنے لڑکے کو سمجھانے سنبھالنے علی گڑھ آیا تھا۔ اس زمانہ میں طرح طرح کے بزرگوں کی اتنی کثرت ہوگئی تھی کہ لوگ گھبرا گئے تھے۔ چنانچہ اب جس لڑکے کے ساتھ کسی غیر معمولی لیکن چالیس سال سے زائد عمر کے بزرگ کو کوئی دیکھ لیتا ہے۔ فوراً کہہ پڑتا ہے۔ "تھو الوالدین" یہاں تک کہ اگر کسی لڑکے کے ساتھ گھر کا کوئی پرانا نوکر بھی آتے تو لوگ کہیں گے فلاں صاحب کے ساتھ "ایک والدین" بھی ہے۔ ایک والدین کا فقرہ علی گڑھ میں قطعاً موزوں سمجھا جاتا ہے مثلاً میں فلاں جگہ جا رہا تھا راستہ میں ایک والدین ملے۔ چنانچہ علی گڑھ کی لغت میں والدین کے معنی خواہ مخواہ ماں باپ کے نہیں ہیں۔ بلکہ کوئی بزرگ نما صورت کا اجنبی جو کسی طالب علم سے وابستہ نظر آتا ہے والدین ہے۔

اس زمانہ میں اور ایسے مواقع پر ایوب مرحوم کام آتے تھے۔ کسی کے لئے چارپائی کی ضرورت ہے۔ تو وہ لا رہے ہیں۔ کسی کے پاس سارٹیفکیٹ نہیں ہے۔ اس کی سبیل نکال رہے ہیں۔ کسی کو مخصوص بورڈنگ ہاؤس میں جگہ نہیں مل رہی ہے تو اس کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ کسی کے پاس روپئے نہیں ہیں۔ تو ادائیگی بالاقساط کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی کے پاس کتاب یا فرنیچر نہیں ہے تو اس کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کوئی اسٹریچی ہال کے عشرستان میں کھو یا گیا ہے تو اسے راستہ پر لگا رہے ہیں۔ والدین یا سرپرستوں نے نئے حقہ یا پرانے اردو نادلوں کی ضرورت ہے۔ تو اسے فراہم کر رہے ہیں۔

اور سب کچھ ہو گیا تو اشارہ کنایہ سے، حیلہ حوالہ سے، خوشامد کر کے، رو پیٹ کر، جھنجلا کر آمادۂ قتل یا خودکشی ہو کر مہمان کو میزبان کا گھر چھوڑنے اور اپنے اپنے ٹھکانے پہنچنے کا مرحلہ طے کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک ہی جگہ نہیں ہو رہا ہے۔ میرے گھر آپ کے گھر، دوستوں کے گھر اور خدا جانے اور کہاں کہاں یہی ڈراما ہو رہا ہے۔ ایوب صاحب ہیں کہ اپنے فرائض اور اپنی مصیبتوں کو نظر انداز کر کے دوسروں اور دوسروں کی مصیبت میں شریک ہیں۔ میزبان مہمانوں سے تو کچھ کہہ نہیں سکتے لیکن آخر غم و غصہ نکالنے کا کوئی موقع تو ہو۔ اس کے لئے ایوب صاحب تھے۔ انہیں بلایا گیا۔ یہ پہنچے تو کچھ متردد ہوتے۔ کچھ نادم اور کبھی کبھی تالی بجا کر قہقہہ لگانے لگے۔ پھر پتہ ہے معلوم ہوتا ہے کوئی اور آ گیا یا کسی اور دوست آئے۔ رشید صاحب واللہ خوب ہوا۔ بڑا مزہ آ رہا ہے اور لکھئے مزاحیہ مضمون۔

ایوب مرحوم کو برج کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ ان کی زندگی میں اور کچھ انہیں کی وجہ سے ہم لوگ بھی اس کے بڑے شائق ہو گئے تھے۔ بازی نہیں لگائی جاتی تھی۔ اس لئے کہ ہم میں ایک سے ایک اناڑی کھیلنے والا تھا۔ جتنا کھیلتے تھے اتنا ہی تنزل کرتے تھے۔ پھر ایک دوسرے کو خواہ وہ جیتے یا ہارے سخت سست اتنا کہہ لیتے تھے کہ کسی اور بدل کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں برج کا لفظ اخبارات میں آیا تھا۔ بے تکلف صحبتوں میں ایوب مرحوم کا یہی نام رکھ دیا گیا تھا۔ مرحوم

بھی کچھ کم نہ تھے۔ ہم سب کو بھی وہ ایسے ایسے ناموں سے پکارتے تھے کہ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ ان کے بغیر تاش کی صحبتیں بالکل بے کیف ہوتی تھیں۔ بعض دفعہ یہ ہوا ہے کہ ایوب مرحوم کھیل میں موجود نہ ہوتے۔ تھوڑی ہی دیر میں سب نے تاش پھینک دئے۔ کہ بغیر سرعن کے کوئی لطف نہیں۔ رات کافی گزر چکی ہے۔ ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں کی موٹر پر ہم سب اُن کی تلاش میں نکلے۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد کسی دوست کے ہاں ملے۔ اپنے گھر چونکہ رہتے ہی نہ تھے۔ اس لئے وہاں ہم سب کبھی نہ گئے۔ دوست کے ہاں بھی رونق محفل وہی تھے۔ اس لئے وہ لوگ بھی مارنے مرنے پر تیار ہوتے کہ ایوب کو جانے نہ دیں گے۔ بڑی بڑی خوشامدوں سے یا لڑ جھگڑ کر انہیں لاتے اور محفل پھر سے جمی۔

تاش کے شائق اتنے تھے لیکن براہِ راست کبھی نہیں کہتے تھے کہ چلئے تاش کھیلا جائے۔ آئے اور بیٹھ گئے۔ ادھر اُدھر کی باتیں شروع کیں۔ میں خوب سمجھتا تھا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ اس لئے عمداً غیر متعلق باتیں چھیڑتا رہا۔[1] یہ برابر وار خالی دیتے رہے۔ آخر کار میں نے کہا۔ ایوب صاحب تم کو تو تاش کا ہیضہ ہے۔ نہایت سنجیدگی سے بولے۔ جی ہاں۔ آپ لوگوں کو تو شاید چھینک بھی نہیں آتی۔

---

[1] ایک دن میں اور ایوب مرحوم بیٹھے ہوتے تھے کہ ایک نہایت دیندار و اجنبی بزرگ آئے شکل سے کچھ قومی کچھ علمی اور تھوڑے بہت سزا یافتہ معلوم ہوتے تھے اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے حرف مطلب زبان پر لائے یہ بھی سوچا تو اور باتیں شروع کریں۔ ایوب صاحب پر رعب پڑ رہا تھا۔ بار بار سگریٹ پیش کرتے اور سر ہلاتے جاتے تھے۔ بزرگ رخصت ہونے لگے تو بولے رشید صاحب آپ جیسا مزاحیہ مضمون لکھنے والا کوئی اور نہیں! ایوب صاحب اُٹھ کر کمرے میں بھاگے جب اجنبی بزرگ جاچکے تو یہ برآمدہ ہنستے ہنستے لوٹے جاتے تھے اور بار بار کہتے تھے اور لکھئے مزاحیہ مضمون!!

میں تیار ہوا۔ دونوں ڈاکٹر اصغر کے ہاں پہنچے۔ ہم خوب سمجھتے تھے کہ وہاں کیا پیش آئے گا۔ ایوب مرحوم کو دیکھتے ہی للکارا۔ ہرگز دروازہ کے اندر قدم نہ رکھنا۔ مرحوم بولے بس بس جناب ڈاکٹر صاحب بہت زور نہ باندھئے۔ دروازہ کے اندر سے خود تو کبھی قدم نکالنے کی ہمت نہیں ہوتی اور بھبکی یہ دیجئے (اتنے میں ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں بھی آگئے تھے۔) معززین شہر تشریف لائے ہیں۔ اصغر صاحب بولے لعنت ہے معززین شہر پر اور آپ پر اسی سانس میں نوکر کو آواز دی۔ میز بچھاؤ، پاندان لے چلو۔ ایوب مرحوم سے مخاطب ہو کر بولے۔ کیوں جی باورچی تلاش کیا۔ مرحوم بولے بھیجا تو تھا۔ آپ کو ملا نہیں؟ بولے لعنت ہے۔ باورچی بھیجا تھا یا بھٹنی۔ اپنی ہی شکل کا ڈھونڈھتے ہو۔ مرحوم نے نہایت سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔ ڈاکٹر صاحب کیا کروں۔ آپ کی شکل والا تو یونیورسٹی والے نہیں چھوڑتے کیا کیا جائے۔

ایوب صاحب کی سیرت و شخصیت کا عجیب اور نادر پہلو یہ تھا کہ بڑے سے بڑا آدمی ہو یا چھوٹے سے چھوٹا ان سے عزت آمیز محبت کرتا تھا۔ ترس کھا کر یا مجبور ہو کر نہیں بلکہ ان سے محبت کرنے میں اُسے لطف آتا تھا۔ ایوب سے محبت کر کے جیسے دل کو تسکین ہو جاتی تھی۔ ایک طرح کی پر افتخار اور اطمینان بخش تسکین جیسے یہ احساس کہ ہم میں بھلائی کرنے یا بلند ہونے کا جذبہ یا استعداد ہے۔ محبت کی ایک قسم وہ بھی ہوتی ہے۔ جو اپنے سے حقیر یا پست حال سے کی جاتی ہے۔ جیسے لوگ اپنے کُتّے سے کرتے ہیں یعنی اُسے سمجھتے کُتّا ہی ہیں۔ لیکن چومتے چمکارتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی محبت بالعموم بڑے آدمی چھوٹے سے کرتے ہیں۔ لیکن تحت شعوری ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ محبت یا اخلاق کا مظاہرہ کرنے کے اعتبار سے تو لوگ انہیں انسان سمجھیں۔ لیکن خود ان کے جذبہ فرعونیت کی تسکین ہو۔ یعنی ہم ایسے ہیں کہ ترس کھا کر اپنے بندے سے محبت کرتے ہیں اور اس طرح طوعہ پر اس کی زندگی میں امید فخر کی ہلکی سی لہر دوڑا کر ہم چشموں میں بیٹھنے اور سربلند ہونے کے قابل بنا دیتے ہیں۔ اس طرح

کی محبت یا عزت ایوب صاحب سے کرنے کی کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ایوب صاحب وہ تھے جن کے لئے ہر شخص اپنی عزت یا شہرت کو داؤ پر لگا دینے کے لئے بے تامل تیار ہو سکتا تھا۔

ایوب سے محبت نہ کیجئے یا ان کی عزت نہ کیجئے تو یہ محسوس ہوتا کہ ہم میں شریفانہ جذبات یا ذمہ داری کی کمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مدِ نظر رکھئے کہ ایوب صاحب کے دل میں یہ بات کبھی گزری ہی نہیں کہ ان کی خدمات کا صلہ مل رہا ہے یا نہیں۔ معاوضہ کا احساس شاید ان میں پیدا ہی نہیں کیا گیا تھا۔ بڑے چھوٹے کی خدمت یکساں لطف و تن دہی سے کرتے تھے۔ پروسٹ کے دفتر میں سب سے اہم عہدہ پر ہونے کے سبب سے ان کا سابقہ طلباء، اساتذہ، بیرا، باورچی، نائی، چپراسی، بھنگی، بہشتی سبھی سے براہِ راست پڑتا تھا۔ طلبا کو خوش اور مطمئن رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ ان کا ایوب صاحب سے طرح طرح سے سابقہ پڑتا تھا۔ وہ ہر طالب علم کے خاندانی حالات و معاملات سے واقف رہتے تھے۔ اور اسی اعتبار سے ان سے سلوک کرتے تھے۔ اس لئے ہر طالب علم ان کو اپنے گھر کے بزرگ اور خیر اندیش کی حیثیت سے دیکھتا تھا۔ یونیورسٹی میں سٹرائک ہے۔ لڑکے ہیں کہ بے قابو ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن ایوب صاحب کا جادو برابر کام کر رہا ہے۔ ایسے زمانہ میں ان کا طرزِ عمل لڑکوں سے وہی ہوتا جو میدان جنگ میں صلیب احمر کا ہوتا ہے۔

ادنےٰ درجہ کے ملازمین سے ان کا سلوک مساوات و ہمدردی کا ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ ایوب کو اپنا افسر نہیں بلکہ رفیق سمجھتے تھے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ بہشتیوں کی کانفرنس کی صدارت کر رہے ہیں۔ اور جیسا کہ ایسی کانفرنسوں میں ہوتا ہے ہر بہشتی آپے سے باہر تھا۔ ایوب صاحب جلدی جلدی سگریٹ پیتے اور بار بار پاجامہ لوبچا کرتے جاتے تھے۔ ہر ایک سے مخاطب ہوتے تھے۔ کبھی خود جامہ سے باہر ہو جاتے اور کبھی نہایت متانت سے سمجھانے لگتے۔ میں ادھر سے نکلا تو کچھ سٹ پٹاتے اور شرماتے۔ میں نے کہا واللہ ایوب آج تو پہچاننا دشوار ہو گیا۔

جا کر مولیناؒ سے کہوں گا۔ کہ نوح کا پسر بدوں میں بیٹھتے بیٹھتے بہشتیوں میں بیٹھنے لگا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کر بڑے زور سے ہنسے کہنے لگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ ذرا بیٹھ جائیے۔ واللہ بڑا مزا آئے گا۔ میں نے کہا جی نہیں آپ کو کیا آج یہ ہے کل بھنگیوں کی کانفرنس کی صدارت کرنے لگیں گے۔ فرمایا ہرج کیا پانی اور فنائل کا انتظام تو کہیں گیا نہیں۔

غرض میں چلا آیا۔ ایوب صاحب بھی صدارت سے فارغ ہو کر تاش کھیلنے کے وقت پہنچ گئے۔

ایوب صاحب یونیورسٹی کے معاملات یا الجھنوں سے ہمیشہ علیحدہ رہتے اور حتی المقدور اپنے دوستوں کو بھی علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ اس قسم کے مسائل پر انہوں نے مجھ سے کبھی گفتگو نہ کی۔ کبھی فرصت ہوتی اور یقین ہوتا کہ میں گھبراؤں گا نہیں تو وہ اپنے خاندانی قضیوں کا تذکرہ چھیڑتے اور جو کچھ دل میں ہوتا بیان کر دیتے۔ میں ان کی الجھنوں کو ہمدردی اور توجہ سے سنتا تو ایسا محسوس کرتے جیسے ان کا جی ہلکا ہو گیا۔ اور ان کے دکھ درد کا مداوا ہو گیا۔ وہ اپنے رشتہ داروں سے کچھ بہت زیادہ راضی نہ تھے سب کے سب ایوب صاحب کی شرافت اور کشادہ دلی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے درپے رہتے تھے۔ اس کا انہیں غم تھا اور غم غلط ہی کرنے وہ میرے پاس آیا کرتے تھے۔ ایک دن بہت اداس تھے۔ آئے تو میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ان کا جی بہل جاتے۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ یک بیک آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے پوچھا تو بڑے تامل کے بعد واقعہ سنایا۔ وہی عزیزوں کی دیانت اور شقاوت کا۔

میں نے کہا۔ ایوب صاحب آپ بد دل نہ ہوں۔ آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور ہے تو صرف اتنا کہ آپ خوش حال اور نیک نام کیوں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بیشتر ہندوستانی اعزا کے دلوں سے نیکی اور فیاضی اٹھالی گئی ہے۔ اغیار کو تو یہ مسرور اور بافراغت دیکھ کر خوش ہوں گے اور

ؔ مولانا ابوبکر محمد شفیت۔ فاروقی صاحب قبلہ ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ایوب صاحب کے عزیز [illegible]

فخر کریں گے لیکن اپنوں کو کھاتا پیتا، ہنستا بولتا دیکھ کر غم و غصہ کے انگاروں پر لوٹنے لگیں گے۔
یہ اپنے نکمے پن اور بے غیرتی کو اپنی بہت بڑی خوبی اور اپنا بہت بڑا حربہ سمجھتے ہیں۔ یہ اپنے کماتے
کماتے عزیز کو غاصب سمجھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ آپ نے اُن تمام نعمتوں پر قبضہ مخالفانہ کر رکھا ہے۔
جو بصورت دیگر ان کے قبضہ میں آتیں۔ وہ کبھی نہ دیکھیں گے کہ وہ خود کتنے ناکارہ اور بے ایمان ہیں اور
جو فراغت نامور ی اور نیکنامی سے رہ رہا ہے۔ اس نے کتنی محنت کی ہے۔ اور اذیت اٹھاتی ہے۔
میں نے تو آج تک اپنے کسی عزیز کو ایسا نہ دیکھا جس میں محنت اور ایمانداری کی استعداد ہوتی۔
اور وہ اپنے کسی عزیز کی فراغت و مسرت پر کڑھتا۔ کڑھتے میں نے انہیں کو پایا جو غایت درجہ کے نکمے
اور بے ایمان ہوتے ہیں ہم

اور یہ کچھ ہمارے بیشتر رشتہ داروں ہی کا حال نہیں ہے۔ بلکہ اس انفرادی کمزوری اور کمینگی نے
پھیل کر جماعتی رنگ اختیار کر لیا ہے۔ جماعتی ہی نہیں بلکہ قومی اور سیاسی بھی۔ سرمایہ و مزدور کی جنگ
اپنی جگہ پر حق بجانب ہے اور جہاں تک اس کے اخلاقی و اقتصادی پہلوؤں کا تعلق ہے۔ اس کے
معقول ہونے میں شبہ بھی نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اس اسکیم کو چلانے والے اور اس سے فائدہ اٹھانے
کے درپے بیشتر وہی لوگ ہیں جو نکمے، بدخود غلط اور کینہ پرور ہیں۔ دنیا کے کسی آشوب کا معائنہ کیجئے آپ
کو بالآخر یہی نظر آئے گا۔ کہ معقول نظام یا تحریک نامعقولوں کے ہاتھ میں تھی۔ آپ ہی سوچئے کیا مزدور
اور کاریگر کے علاوہ کوئی اور طبقہ اس دُنیا میں قابل عزت و لحاظ نہیں ہے۔ اور کیا مزدور کاریگروں
ہی سے وابستہ ہے؟ دُنیا کی نجات دولت کی مساوی تقسیم پر نہیں ہے۔ بلکہ محنت اور قابلیت کی
صحیح احساس و تنظیم پر ہے۔ میں آج کل بازیگروں کے اصولی تقسیم کا قائل نہیں جس سے "دولت" ان
کے ہاتھ میں جاتے اور "مساوی" میرے ہاتھ میں آتے!

آخر میں میں نے ان سے کہا۔ ایوب صاحب اپنا کام کئے جائیے۔ دولت و شہرت کا حساب

و مطمئن ضرور ہوتا ہوں۔ لیکن جب رفیق اور ایوب یاد آتے ہیں تو دل بے اختیار ہو کر ناممکنات کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ یعنی کاش دونوں زندہ ہو جاتے اور میں انہیں اسی مکان میں گلے لگاتا۔ ان کا خوش ہونا اور دھوم مچانا دیکھتا اور مطمئن ہو جاتا کہ میں نے بھی کچھ کام کیا!

سردی کا زور اور دوستوں کا مجمع تھا۔ ہم سب ڈاکٹر عباد الرحمن خاں کے ہاں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے کہ ایوب مرحوم نے کہا۔ سردی لگ رہی ہے۔ کسی نے توجہ نہ کی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد لیکن کسی قدر بیقرار ہو کر کہا۔ بڑی سردی ہے۔ "رشید صاحب میں چلا"۔ ڈاکٹر عباد نے کہا ستم ڈھانے سے رہتے ہو سردی کیوں نہ لگے۔ یہ کہہ کر اندر سے اپنا وزنی گرم اور کوٹ لاتے اور مرحوم کو اچھی طرح اڑھا دیا۔ چائے منگائی اور پلائی۔ اس کے بعد ہی مرحوم نے کہا "رشید صاحب میں چلا" میں ان کے لہجہ سے اور ان کے چہرہ کی طرف دیکھ کر چونکا۔ کھیل ختم کر دیا گیا اور ہم سب انہیں اڑھا ڈھکا کر ان کے مکان پر پہنچا آئے۔ صبح سے بخار نے زور پکڑا۔ لاکھ لاکھ جتن کئے گئے۔ لیکن بخار اور کمزوری بڑھتی ہی گئی۔ دوستوں کی تشویش بڑھی۔ مایوسی بڑھی اور مرض الموت بڑھا۔ دو تین ہفتہ کے اندر سب کچھ ہو گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ مرض کیا تھا۔ سب نے یہی فیصلہ کیا کہ وقت آ پہنچا۔

شام کے قریب نزع کے عالم میں تھے۔ مکان کے باہر یونیورسٹی کے طلباء اور عمائدین کا مجمع تھا۔ لیکن ان سے قریب اور انہیں میں ملا جلا ایک اور ہجوم تھا۔ بھنگی۔ بہشتی۔ چپراسی۔ نائی۔ دھوبی۔ بیرے۔ باورچی۔ خانساماں۔ خوانچہ والے اور ان میں سے بعضوں کے بیوی بچے خاموش۔ مایوس سر جھکائے! اور یہ وہ ہجوم تھا جو کسی مرنے والے کے دروازہ پر جب کہ وہ اس جہان سے گزرنے والا ہی ہو۔ میں نے گزشتہ پچیس سال بھر نہیں دیکھا تھا۔

مرحوم کو سپرد خاک کیا گیا۔ مولینا ابوبکر صاحب نے قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر فرمایا!۔ بھائیو! "ایوب اپنے پیدا کرنے والے کے ہاں پہنچ گئے اگر ان سے تم کو کوئی تکلیف پہنچی ہو

تو معاف کر دینا۔"

گریہ سب کے گلو گیر ہوا۔ کسی نے روکا اور کسی سے نہ رکا!

ایک غم نصیب کے قلب کی گہرائیوں سے ایک اور دردناک صدا بلند ہوئی۔

"کیا یہاں کوئی اب بھی موجود ہے جس پر آپ کی خدمات کا صلہ واجب الادا نہ ہو۔" اس آواز کو سنا کسی نے نہیں محسوس سب نے کیا!

سر اقبال مرحوم

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان!

بڑی گرمی پڑ رہی تھی۔ دُور دراز کے سفر سے واپس آ رہا تھا۔ علی گڑھ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اُترا ہی تھا۔ کہ ایک عزیز نے کہا، ڈاکٹر اقبال کا انتقال ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے لئے، بہت تھوڑی دیر کے لئے کچھ ایسا معلوم ہوا۔ جیسے پلیٹ فارم کی ہر چیز موجود تو ہے۔ لیکن اس کی نہ کوئی آواز ہے۔ اور نہ اس میں کوئی حرکت۔ یہ بات صرف ایک آن کے لئے تھی، کائنات کا پھیلانے، پسینے اور پیدا کرنے والا، پُرہیبت و پُراسرار گراں پیکر پہیہ جو آن کی آن رُک کر اُلٹا چلنے والا معلوم ہوتا تھا، اپنے مقررہ رُخ و رفتار پر لوٹ گیا۔ زندگی اپنے تمام ہنگاموں کے ساتھ پھر

رواں دواں نظر آنے لگی۔ مکان واپس آیا۔ نہ نہانا اچھا معلوم ہوتا نہ کھانے کو جی ہوا، جیسے نفس اپنے مطالبات چھوڑ بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے کمرہ بند کرکے لیٹ رہا۔

ذہن نے ماضی کے اوراق ایک ایک کرکے پلٹنے شروع کر دئے۔ طفولیت کا زمانہ یاد آیا۔ جب اقبال کے اشعار پیٹھنے کی دوستی کی طرح مزے دار اور جان نثار معلوم ہوتے تھے اور خود اقبال کا یہ تصور تھا کہ وہ جو اشعار کہتے ہیں انہیں میں رہتے بستے ہیں۔ اقبال کی صورت وہی ہوگی۔ جو میرے اپنے تصورات کے عمل سے پیدا ہوتی تھی۔ بہت اچھی سی، بہت چاہی جانے والی، جیسی جادوگروں جیسی، کچھ عجیب سی۔

یہ بات بھی کچھ کم عجیب نہیں ہے کہ اب بھی جب کہ ادراک و شعور ایک گونہ مکمل ہو چکا ہے۔ اچھے اشعار کا مجھ پر وہی اثر ہوتا ہے جو بچپن میں ہوتا تھا۔ معنی و مطلب کے متعین ہونے کے بعد بھی تھوڑی دیر کے لئے معلوم نہیں کیا چیز تصورات کو معلوم نہیں کہاں کہاں لئے پھرتی ہے۔ وہی افسانہ و افسوں، وہی روشنی و تاریکی، لذت و اذیت، خوف و امید جو بچپن میں پیدا ہوتے تھے اب بھی بیدار ہو جاتے ہیں، جہاں چاہتے ہیں لئے پھرتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں چھوڑ دیتے ہیں۔

۱۹۲۵ء میں میں مرحوم سے ملنے لاہور گیا تھا۔ اقبال کے کلام میں جو باتیں بچپن کے تجسس میں دلچسپ معلوم ہوتی تھیں۔ اب تجزیہ و تجربہ کی زد میں ناقابل فہم معلوم ہونے لگی تھیں۔ میں صرف پڑھنے اور اپنے طور پر لطف لینے کی منزل سے گزر چکا تھا۔ اب پڑھانے کو پُر فکر و پُر لطف بنانے کا فرض عائد ہوتا تھا۔ شعر میں شاعر غالب نظر آتا تھا اور ہر دل آویزی تاثرات پر ہی نہیں۔ بلکہ فکر و تجربہ کی صحت و صداقت پر منحصر معلوم ہوتی تھی۔ یہ وہ مرحلہ تھا جہاں میں نے محسوس کیا کہ خود شاعر کو دیکھا جاتے۔ اس کے اشعار ہی سے نہیں بلکہ اس کی شخصیت سے بھی ربط پیدا کرنے کی کوشش کی جاتے۔ شاعر اپنی ترنگ میں جو چاہتا ہے۔ کر دکھاتا ہے۔ یہ تو نسبتاً آسان ہے

دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کی ترنگ یا تذبذب سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہی
جذبات کی ترجمانی کر سکتا ہے۔ یا دوسروں کی تشفی بھی کر سکتا ہے۔

غالباً دن کے نو دس بجے ہوں گے، میں مرحوم کی کوٹھی پر پہنچا۔ کپڑے پہن کر کسی مقدمہ کی پیروی
میں جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ سیاہ شُغدہ (ربو) باندھے کالر درست کرتے ہوئے برآمد ہوئے۔
گٹھا ہوا جسم، چوڑی چکلی ہڈیاں مردانہ انداز، آنکھوں کی ساخت اور مونچھوں کی وضع کسی قدر تورانیوں
جیسی، سوٹ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا مسکرانے میں آنکھوں کے گوشوں میں جھریاں پڑتی تھیں۔ جن
سے ذکاوت و ملاطفت کا اظہار ہوتا تھا۔ بڑی خوش دلی اور شفقت سے ہاتھ ملایا اور کسی قدر
دیر تک ہاتھ میں لئے رہے۔ بھاری بھر کم لہجے میں بولے، آپ ہیں جی، صدیقی صاحب! میں اقرار کرتا
ہوں کہ مرحوم کا ڈیل ڈول اور ان کا حلیہ دیکھ کر متحیر اور مرحوم کے اندازِ تخاطب اور لہجہ سے کسی قدر
دل گرفتہ ہوا۔ اتنے میں نوکر کو آواز دی اور پنجابی میں قلم لانے کو کہا۔ قلم کا تلفظ سن کر میں گھبرا اٹھا۔
علی گڑھ میں پنجابی تلفظ سے آشنا ہو چکا تھا لیکن ذہن میں معلوم نہیں۔ کیوں یہ بات جم گئی تھی کہ ڈاکٹر
اقبال اس طرح کی معذوریوں سے مستثنیٰ ہوں گے۔

لیکن میں کیا بتاؤں کہ اپنی پہلے سے بنائی ہوئی بہشت کو یوں درہم برہم ہوتے دیکھ کر مجھ پر جو
اثر جس درجہ ہونا چاہئے تھا۔ وہ نہ ہوا۔ مرحوم کچھ اس انداز سے ملے اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ خود
ان کے تلفظ میں کچھ ایسا خلوص اور ان کے ہاتھ ملانے میں وہ شفقت اور ناقابل بیان مروت و مرحمت
تھی کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اقبال ایسے نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا جیسے ایک نیا تجربہ
بڑا اچھا تجربہ حاصل ہوا جس کا میں مستحق ضرور تھا۔ گو اس کا منتظر نہ تھا۔ جیسے مجھے ایک نئی حس تفویض
ہوئی جس کو چھین لیا جاتا تو میں کوئی بڑی کمی محسوس کرنے لگتا۔

تھوڑی دیر کے لئے کمرہ میں آ بیٹھے۔ علی گڑھ کا حال دریافت فرماتے رہے۔ آواز بھاری تھی۔

لیکن بلند ہونے کے ساتھ ساتھ زور اور صفائی بڑھتی جاتی ہیں نے اس خود اعتمادی کے ساتھ جس میں عالمانہ اور والہانہ دونوں انداز متوازی و متوازن ہوں کم لوگوں کو گفتگو کرتے سُنا ہے۔ یہی بات مجھے ڈاکٹر× صاحب میں ملتی ہے۔ علامہ مرحوم کی باتیں سُنتے بشرطیکہ وہ بات کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو فوراً محسوس ہوگا۔ کہ ان کی باتیں صرف زبان سے نہیں ادا ہوتی تھیں اور وہ صرف اپنے الفاظ اور فقروں پر نہیں بھروسہ کرتے تھے بلکہ وہ باتیں کہیں دُور سے اور بڑی گہرائی سے آتی تھیں۔ ان کی گفتگو حشو و زوائد سے قطعاً پاک ہوتی تھی کہ وضاحت و جامعیت بجائے خود صنائع و بدائع معلوم ہونے لگتی تھیں۔ گفتگو کرنے میں ان کی آنکھیں نصف سے بھی کچھ کم کھلی رہتی تھیں۔ البتہ جب گفتگو میں گرمی اور روانی پیدا ہو جاتی تھی تو آنکھیں پوری کھل جاتی تھیں اور چہرہ پر خون کی سُرخی جھلکنے لگتی تھی۔

اُسی دن شام کو دوسری ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے اُس وقت ایک نوجوان شاعر آگئے جو کچھ دیر تک اپنا فارسی کلام سُناتے رہے، اُن کی شاعری اور لہجہ دونوں پر جدید ایرانی رنگ غالب تھا۔ کچھ اور لوگ بھی آگئے۔ نوجوان کی گفتگو میں تعلّی زیادہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی مسلسل خاموشی کسی قدر بیزاری میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ کچھ دیر تو بیٹھے رہے اس کے بعد اُٹھ کھڑے ہوئے۔ صحبت ختم ہوگئی۔ صرف دو چار اصحاب بیٹھے رہ گئے۔ اندر سے دیر میں برآمد ہوئے۔ چہرہ پر اب بھی انقباض طاری تھا۔ تھوڑی دیر تک حقہ کا ٹھہر ٹھہر کر کش لیتے رہے۔ اس کے بعد فرمایا نعمت کے مطابق انسان کو ظرف نصیب نہ ہو تو نعمت لعنت بن جاتی ہے۔ اس کے بعد کچھ اور لوگ آگئے۔ اب طبیعت بحال ہوگئی تھی ہر ایک سے پرسش حال کرتے وہ بھی اس طور پر نہیں کہ موسم اچھا ہے یا بُرا۔ رسمی باتیں تو وہ کرنا ہی نہیں جانتے تھے۔ ہر ملنے والے سے اس کے مشاغل اور اس کا مخصوص دکھ سکھ سُنتے۔ لوگ مرحوم کے حلقہ میں معتقدین کی حیثیت سے ڈرے سہمے ہوئے نہیں بیٹھتے تھے۔ بلکہ محبت اور بے تکلفی کی فضا ہوتی تھی۔ ہر شخص

× ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعہ دہلی۔

مرحوم کی باتیں بڑی گہری توجہ سے سنتا اور خود بھی بے تکلفی سے اپنی سناتا۔

دوسرے دن پھر مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آج کہیں جانا نہ تھا اس لئے بڑے اطمینان اور بے تکلفی سے باتیں شروع کیں۔ اس زمانہ میں اقبال کے نظریہ فوق البشر کا بڑا چرچا تھا۔ بعض باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اس لئے اس پر میں نے خاص طور پر اپنے شبہات کا اظہار کیا۔ مرحوم نے بڑے ہی عالمانہ انداز سے اور انتہائی خوش دلی اور خود اعتمادی کے ساتھ جو ان کی سیرت کا بڑا ہی گراں قدر پہلو تھا۔ اظہار خیال کرنا شروع کیا۔ مجھے اس وقت جو چیز سب سے عجیب اور خوش آئند معلوم ہوئی۔ وہ یہ تھی کہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو مرحوم کس خوبی سے واضح کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا جیسے متنازعہ فیہ مسئلہ میں کوئی پیچیدگی تھی ہی نہیں مخلصانہ نقطہ نظر کی یہ کرامت ہے کہ ناگہانی پیچیدگیوں اور نامعلوم مسائل کا حل بڑی آسانی سے سامنے آجاتا ہے۔ اسی صحبت میں عورتوں کا درجہ، فوق البشر، بعثت نبوی کا وقت اور مقام، فقہ اسلامی میں اجتہاد کے مسائل پر تقریباً تمام دن گفتگو فرماتے رہے۔ میں نے اس بحث کا خلاصہ اپنے بعض گزشتہ مضامین میں جہاں تہاں کیا ہے لیکن ایک بات جس کا اعادہ میں بار بار کرتا رہا۔ وہ یہ ہے کہ مرحوم کو صرف شاعر سمجھ لینا یا یہ کہ ان کے خیالات یا تصورات تمام کے تمام ان کے کلام میں مقید ہو چکے ہیں۔ بڑی غلطی ہے۔ مرحوم کی فکر و نظر کا بہت کم حصہ ان کے کلام میں منتقل ہوا ہے۔ وہ بہت کچھ جانتے تھے اور یہی نہیں بلکہ اکثر کچھ ایسا بھی محسوس ہوتا جیسے بعض بالکل ہی نئی باتیں دوران گفتگو میں ان پر کسی کوشش کے بغیر منکشف ہو گئیں۔

فقہ اسلامی میں اجتہاد کے مسئلہ پر وہ انگریزی میں بہت کچھ لکھ چکے تھے، مسودہ بھی تیار ہو چکا تھا اور کافی ضخیم تھا۔ فرمایا ان مسائل پر میں بعض مستند علماء سے تبادلہ خیالات کرنا چاہتا ہوں، تمہارے نزدیک کون لوگ ایسے ہیں جن سے رجوع کرنا سود مند ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس کو چھپتے [illegible] ہوں۔ اس کے علاوہ میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے بیشتر

علما علم دین سے تو پورے طور پر واقف ہوتے ہیں۔ لیکن موجودہ عہد کے اکثر مسائل کچھ ایسے پیچ در پیچ ہوتے ہیں اور ماہرین فن ہی کے پیدا کئے ہوتے ہوتے ہیں اس لئے ان پر ہمارے علمائے کرام مناسب رائے قائم کرنے سے معذور رہتے ہیں۔ جب تک متنازعہ فیہ مسئلہ کی ماہیت نہ معلوم ہو۔ اس وقت تک ان پر صحیح حکم لگایا کیسے جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے سامنے مسائل کی جو نوعیت ہے اس پر اگر مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اور مولانا سید سلیمان ندوی صاحب سے رجوع کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ مرحوم نے یہ فرمایا کہ وہ ان دونوں بزرگوں سے تبادلہ خیالات کر رہے ہیں۔ یا کریں گے۔ اتنا البتہ یاد ہے کہ دونوں کے بارہ میں مرحوم نے اچھے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ خطوط کا جواب جلد سے جلد دیتے۔ اور جب تک بینائی نے ساتھ دیا ہر خط کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجتے۔ ان خطوط میں رسمی تکلفات کو بالکل دخل نہ ہوتا۔ اور ہر بات کا جواب نہایت واضح اور جامع ہوتا۔ وہ مشکل سے مشکل اور نازک سے نازک مسئلہ میں بھی بڑی صاف گوئی سے کام لیتے۔ بڑے آدمیوں کی طرح ان میں یہ کمزوری نہ تھی۔ کہ جوابات ایسے ہوں کہ موقع بے موقع کترا کے نکل جانے کا امکان باقی رہے۔ ان کو اپنے جوابات پر بڑا اعتماد ہوتا۔ اس کا سبب میں سمجھتا ہوں، یہ ہے کہ وہ فلسفی، مفکر اور مقنن ہونے کے علاوہ بڑے اچھے وکیل (بیرسٹر) بھی تھے۔ وہ جو کچھ کہتے یا لکھتے اس میں جذبات کو اتنا نہیں جتنا کہ فکر و تدبر کو دخل ہوتا۔ چنانچہ ان کی تحریر و تقریر دونوں میں ایک اچھے قانون دان اور اچھی وکالت کرنے والے کا منطقی ربط ہوتا۔

ان کی شاعری کا امتیازی پہلو بھی یہی تھا۔ جس طرح مسائل کی توضیح میں تدبر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی تدبر حکیم یا فلسفی کی بڑائی یا کامیابی کی دلیل ہے۔ ٹھیک اسی طور پر جذبات کا

اعتساب کرنا اور اس کو مناسب و موزوں اسالیب میں ڈھالنا شاعر کی بڑائی کی دلیل ہے اقبال کی شاعری خود شاعری کی معراج ہے۔ انہوں نے جذبات کو فکر کا درجہ دے دیا ہے اور فکر کو جذبات کا آب و رنگ بخشا۔ دونوں صورتوں میں اقبال کا آرٹ اور ایقان دوش بدوش کار فرما ملتا ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کا کلام پڑھ کر ہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اقبال کہاں اور کہاں تک حکیم اور کہاں اور کس حد تک شاعر ہیں۔ بلکہ حکیم اور شاعر (البتہ کہیں حکیم پہلے اور شاعر بعد میں اور کبھی اس کے خلاف۔ لیکن بالآخر دونوں) ایک دوسرے میں ممزوج یا ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔ اور یہی اقبال کا آرٹ ہے۔ اس کا سبب میرے نزدیک یہ ہے کہ اقبال نے فطری ملکات کو بشری ریاضتوں اور ماورائی بصیرتوں سے ایک نئی حسین اور لازوال صورت یا نوعیت بخشی۔ شاعر کا طبعاً شاعر یا مفکر کا طبعاً ہونا میرے نزدیک کوئی بہت بڑی نعمت نہیں ہے۔ نعمت تو وہ توفیق ہے جو فطری استعداد کو بشری نعمت بناتی ہے اور غالباً یہی توفیق وہ توفیق الٰہی ہے جو انسانیت کو نہ صرف انسانوں کے ہاتھ ہلاک ہونے سے بچاتی رہتی ہے۔ بلکہ انسانوں ہی کے ہاتھ انسانیت کو فوز عظیم پر فائز کرتی ہے۔

علی گڑھ میں ایک دن دوستوں کی ایک علمی صحبت میں حافظ کے مشہور شعر

صد باد صبا اینجا بے سلسلہ می رقصد

این است حریف اے دل تا باد نہ پیمائی

پر گفتگو ہونے لگی۔ ہر ایک نے اپنے نقطۂ نظر سے خوب خوب موشگافیاں کیں۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ ڈاکٹر اقبال سے رجوع کیا جائے۔ چنانچہ مرحوم سے استصواب رائے کیا گیا۔ مرحوم نے فوراً ہی جواب لکھ بھیجا۔ ہر رائے پر محاکمہ کیا۔ اور آخر میں لکھا کہ شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے مطالب کو ریاضیات کے اصول مدنظر رکھ کر پیش کرے اس لئے شعر کے

مطالب جداگانہ بھی ہو سکتے ہیں۔ البتہ متضاد نہ ہوں۔ آگے چل کر لکھا تھا کہ کبھی کبھی شاعر اپنی واردات کا پورے طور پر خود استقصا نہیں کر سکتا۔ ایسی حالت میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ واقعہ بیان کرنے کے بجائے ایسی فضا کی طرف رہبری کر دے جس میں اس واقعہ کے پیش آنے کا تو ہی امکان ہو اور جہاں ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق اپنے مطلب کی چیز ڈھونڈ لے آخر میں لکھا تھا کہ شاعر کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو منطق سے نہیں بلکہ ان رموز سے اپنا لے جو اس کے شعر میں دھوپ چھاؤں کی کیفیت پیدا کر رہے ہوں۔ شاعرانہ رموز نہ منطقیانہ رموز ہوتے ہیں نہ فلسفیانہ، وہ شاعرانہ ہی رموز ہوتے ہیں۔

سنہ ۳۰ء میں میں بہت بیمار تھا۔ ڈاکٹر صاحب انہیں دنوں یاد نہیں آتا کس سلسلہ میں علی گڑھ تشریف لاتے تھے۔ ایک دن صبح مکان تشریف لاتے۔ اس روز مجھے خاص طور پر بڑی تکلیف تھی بمشکل سے باہر آیا۔ میں نے بڑی مایوسی کے ساتھ رک رک کر کہا ڈاکٹر صاحب کاش میں اتنا بیمار نہ ہوتا کہ آپ کے دوسری جگہ قیام کرنے کی مایوسی اور شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ ہائے اُن کا وہ چونک کر لیکن فوراً ہی مسکرا کر بڑے وقار اور شفقت سے اپنے مخصوص لہجہ میں فرمانا نہیں جی صدیقی صاحب، کوئی بات نہیں۔ اللہ اپنا فضل کرے گا۔ اچھے ہو جاؤ گے، پھر لاہور آنا، مایوس کیوں ہوتے ہو، مایوس ہونے سے جانتے ہو ایمان میں خلل پڑتا ہے اور اس سے اللہ کریم کی توہین ہوتی ہے۔ اچھے مسلمانوں کو اس کی احتیاط رکھنی چاہیئے۔

اس کے بعد دیر تک اس انداز سے گفتگو کرتے رہے کہ میں ان کی موجودگی میں یہ بھول گیا کہ بیمار بھی تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات آ نہیں سکتی تھی کہ میں تو اچھا ہو جاؤں گا اور ڈاکٹر صاحب اس جہان سے اٹھ جائیں گے۔ اکثر یہ خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس تکلیف میں

مبتلا رہ کر عالم بقا کو سدھارے۔ کاش کسی وقت میں حاضر خدمت ہو کر ان کے لئے وہ کر سکتا جو انہوں نے میرے لئے کیا تھا۔ پھر سوچتا ہوں ڈاکٹر صاحب بہت بڑے شخص تھے ان کو مجھ جیسا معمولی شخص کیا تسکین یا تشفی دے سکتا تھا وہ خاصان بارگاہ سے تھے۔ اُن کا خدا سے خاص تعلق تھا۔ لیکن اس بات سے طبیعت مطمئن نہیں ہوتی۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ گو معجزہ کا زمانہ نہیں رہا۔ لیکن محبت و خلوص میں اب بھی بڑی کرامتیں پوشیدہ ہیں۔ دوسروں کی وہ کونسی تکلیف ہے۔ جس کو میں یا آپ محبت سے کچھ اور نہیں تو تھوڑی دیر کے لئے زائل نہیں کر سکتے۔

زندگی کے آخر عہد میں مرحوم کا توسل دربار بھوپال سے ہو گیا تھا۔ اس تعلق کے پیدا کرنے میں سر سید راس مسعود مرحوم کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ اقبال کو جن مالی دقتوں کا سامنا تھا۔ اب اس سے نجات ہو گئی تھی۔ آخر کی بیشتر مشہور نظمیں مرحوم نے بھوپال ہی میں لکھیں۔ بھوپال کا تنہا یہ کارنامہ میرے نزدیک ان کارناموں میں سے ہے جن کو آئندہ آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہ کر سکینگی۔ اگر افراد کی مانند اداروں کی بھی کوئی سعادت ہے تو اسی ایک نیک کام کے صلہ میں بھوپال کی نجات اُخروی یقینی ہے۔ اقبال کو غم روزگار سے نجات دلانا میرے نزدیک بہت بڑی سعادت ہے۔ چنانچہ اقبال کے بعض عقیدت مند سر راس مسعود مرحوم اور نواب محمد حمید اللہ خاں بالقابہ کی اس فرض شناسی اور علم دوستی کو ان عزیزہ و گرامی ہستیوں کی اور بہت سی منزلتوں پر فوق رکھتے ہیں۔ اگر انگریز قوم کے بارہ میں یہ بتایا جاتا ہے۔ کہ وہ برطانوی سلطنت سے محروم ہونا پسند کرے گی لیکن شکسپیر کو چھوڑنا گوارا نہ کرے گی۔ تو میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی گراں سے گراں قیمت پر اقبال سے جدا ہونا پسند نہیں کریں گے۔

مرحوم کو سید راس مسعود مرحوم سے بڑی شیفتگی تھی۔ اسی طرح سر راس کو بھی اقبال سے بڑا شغف تھا۔ لیڈی مسعود کو اقبال مرحوم سے جو عقیدت تھی اور جس طور پر ڈاکٹر صاحب کی صحت

آرام کا موصوفہ خیال رکھتی تھیں۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھوپال میں بڑے اصرار کے ساتھ ایک خوش الحان قاری مقرر کرادیا تھا جو ہر صبح آدھ گھنٹہ تک لیڈی مسعود کو کلام پاک سناتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لیڈی موصوف کی دوسری بچی نادرہ پیدا ہونے والی تھی۔ مرحوم فرماتے تھے کہ ایام حمل میں کسی خوش لحجہ قاری سے اگر ماں کلام پاک سن لیا کرے تو بچے پر اس کا اثر بہت اچھا پڑے گا۔ ممکن ہے یہی خیال ہو۔ جس کی بنا پر اقبال نے ارمغان حجاز میں دختران ملت کو یوں مخاطب کیا ہے۔

ز شام ما برون آور سحر را | بہ قرآں باز خواں اہل نظر را
تو میدانی کہ سوز قرأت تو | دگر گوں کرد تقدیر عمرؓ را

مرحوم کا ملازم رحیم بخش اس پر مامور تھا کہ قاری صاحب آئیں تو لیڈی مسعود کو کلام پاک سننے کیلئے فوراً آمادہ کرے مرحوم خود بھی دیکھتے رہتے کہ یہ فریضہ پورا ہوتا رہتا ہے یا نہیں ایک دن کا واقعہ ہے مرحوم نے رحیم بخش کو آواز دی کہ قاری صاحب آتے ہوتے ہیں، لیڈی مسعود کہاں ہیں۔ رحیم بخش نے کسی قدر آزردہ اور تلخ ہو کر اپنی زبان میں کہا، قرآن کیا سنیں گی۔ وہ تو صبح ہی صبح باغ میں پھول کاٹنے چلی جاتی ہیں۔ وہاں سے فرصت ملے تو آئیں میں کیا کروں، مرحوم خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا صبر رحیم بخش صبر، یہ کام بھی اتنا ہی ضروری ہے!

. اہل نظر جانتے ہیں اقبال کی نظر کہاں تھی۔ میرے نزدیک تو اقبال کا یہی فیصلہ اور اتنا ہی سا جملہ ان کی فکر، فرزانگی شاعری و شخصیت اور ان کا مجموعہ ان کی آفاقی بصیرت کا پورے طور پر ترجمان ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال ہم سے آپ سے اور بہت سے دوسرے لوگوں سے جو ہم سے آپ سے بڑے ہیں ملتے ہیں اور جدا ہو کر ان پہنائیوں میں داخل ہو جاتے ہیں جن کی تشریح تو درکنار ان کا تصور بھی دشوار ہوتا ہے۔

بے موقع نہ ہوگا اگر یہاں ایک واقعہ مولینا محمد علی مرحوم کا بھی بیان کر دیا جائے۔ مولینا تحریک

خلافت کے سلسلہ میں یورپ جا رہے تھے۔ ایک الوداعی صحبت میں کسی صاحب نے مولانا سے سوال کیا، اور کیوں جناب، راستہ میں دل بہلانے کی خاطر کوئی کتاب بھی ساتھ لے جا رہے ہیں، مولانا نے فرمایا کیوں نہیں، دوسرے صاحب نے پوچھا معاف فرمائیے گا کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کس کس قسم کی اور کونسی کتابیں ہیں۔ مرحوم نے فرمایا دو کتابیں کافی ہیں اور وہی میں نے رکھ لی ہیں۔ حاضرین ان کتابوں کا نام سننے کے لئے سراپا اشتیاق بن گئے۔ مرحوم نے اپنے خاص انداز میں فرمایا ایک تو کلام پاک ہے اور دوسری دیوان واہ! غالب

اسے محض ایک لطیفہ ہی کیوں نہ سمجھا جاتے لیکن یہ بیان واقعہ ہو تب بھی میرے نزدیک اس سے مولانا کی پر تجمل شخصیت کی دلربائی کچھ بڑھ ہی جاتی ہے۔ یہاں ہم کسی طویل نفسیاتی مذاکرہ کو راہ دینا نہیں چاہتا۔ اصل مقصد دو عظیم المرتبت شخصیتوں کی ذہنی پرواز و پرداخت کی طرف صرف اشارہ کرنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے لیڈی مسعود کی پہلی بچی کے شیر خوارگی میں وفات پا جانے پر رنجور ماں کو تسکین و تشفی کا بڑا اچھا خط لکھا تھا اور آخر میں یہ شعر لکھا تھا۔

در چمن بود و لیکن نتواں گفت کہ بود
آہ! ازاں غنچہ کہ باد سحر او را نکشود

اس کے بعد نادرہ پیدا ہوئی تو ڈاکٹر اقبال بھوپال میں تھے اور لیڈی مسعود اندور میں۔ نادرہ کی ولادت سے اقبال بے انتہا مسرور تھے اور اس کو دیکھنے کے لیے حد مشتاق۔ تھوڑے ہی دنوں بعد لیڈی مسعود اطلاع دیتے بغیر بھوپال آ گئیں۔ اتفاق سے سر راس مسعود اور سر اقبال دونوں یکجا تھے۔ سر راس نے فرط اشتیاق سے آگے بڑھ کر بچی کو آغوش میں لینا چاہا، اقبال نے آواز دی، نہیں پہلا حق شاعر کو پہنچتا ہے چنانچہ ماں نے نادرہ کو ڈاکٹر صاحب کی گود میں دے دیا۔

مجھے اکثر خیال آتا ہے کیا نادرہ بڑی ہو کر کبھی اس پر بھی غور کرے گی یا نہیں کہ وہ نہ صرف بڑے باپ کی بیٹی ہے بلکہ جب وہ ماں کے پیٹ میں تھی اس کی نفسیاتی پرداخت کا اہتمام اپنے زمانہ میں اسلام کے سب سے بڑے اور برگزیدہ شاعر نے کیا تھا اور آغوشِ مادر سے سب سے پہلے براہِ راست وہ اسی شاعر کے آغوش میں آئی۔

ڈاکٹر صاحب نے جاوید اور بانو کی تربیت و نگہداشت کے لئے ایک شریف جرمن خاتون کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ یہ خاتون میرے ایک عزیز دوست کی رشتہ دار ہیں اور کچھ عرصہ تک میری بیوی بچوں کے ساتھ گھر کے ایک عزیز رکن کی حیثیت سے رہ سہ چکی تھیں۔ میں نے ہی ڈاکٹر صاحب سے تحریک کی تھی کہ یہ خاتون بچوں کی نگرانی و تربیت و تہذیب میں بہت مفید ثابت ہوں گی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب سے کچھ عرصہ تک خط و کتابت ہوتی رہی۔ میں نہیں بتا سکتا کہ مرحوم ان بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف سے کتنے فکرمند تھے۔ ان کو معاوضہ کی کمی بیشی پر مطلق اصرار نہ تھا لیکن وہ خاتون کی سیرت و عادات کی چھان بین میں اس درجہ کاوش کرتے تھے۔ کہ بالآخر میں نے کسی قدر تھک کر ڈاکٹر صاحب کو لکھ دیا کہ آپ کا نقطۂ نظر میں پورے طور پر سمجھ چکا ہوں۔ مزید گفتگو سے کہیں بہتر یہ ہوگا کہ آپ امتحاناً انہیں دو ایک ہفتہ کے لئے اپنے ہاں بلا لیں۔ اور ان کے انداز و اطوار کو نظر میں رکھیں۔ اس کے بعد فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ ان کا رکھا جانا مناسب ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب اس تجویز کو مان گئے اور جرمن خاتون جن کو ہمارے ہاں کے چھوٹے بڑے سب آپا جان کہا کرتے تھے لاہور پہنچ گئیں۔ ان کے پہنچنے کے بعد مرحوم کے جو خطوط آتے ان میں ہر ایک میں ان خاتون کی شرافت وفا طینت، دیانت و امانت، محبت و مروت کا ذکر ہوتا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو ان پر اتنا اطمینان و بھروسہ ہوا کہ رحلت کے وقت مرحوم نے ان دونوں بچوں اور سارے گھر بار کو خاص طور پر ان کے سپرد کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات پر بہت سے لوگوں نے ان جرمن خاتون کے بارے اچھے الفاظ میں اپنے مضامین اور بیانات

میں تذکرہ کیا۔

مرحوم کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد میں لاہور گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے جاوید اور بانو کو دیکھا۔ جاوید کسی قدر سیانا تھا ایک حد تک خاموش اور کم آمیز۔ کھل کر ملنے یا بات کرنے میں بھی تکلف کرتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مرحوم کو جاوید کس درجہ عزیز تھا اور وہ اس کو کیا دیکھنا چاہتے تھے۔ اور جاوید ان کے کلام میں کہاں کہاں اور کس کس طرح جاری و ساری تھا۔ لیکن میں نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ خود جاوید پر اس کا وہ اثر نہیں ہے جو ہونا چاہیے تھا لیکن بانو! مشکل سے ۱۰ سال کی عمر ہوگی۔ کیسی تندرست، چنچل، ذہین، خوبصورت بھولی بھالی بچی! ایسی لڑکی جو صرف ڈاکٹر اقبال کی لڑکی ہو سکتی تھی!!

جرمن خاتون نے بتایا کہ ڈاکٹر اقبال کی وفات کے بعد ایک رات بانو حسب معمول میری چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی، باتیں کرتی اور خاموش ہو جاتی، پھر باتیں کرنے لگتی لیکن رہ رہ کر کسی ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جاتی۔ میں نے پوچھا، بانو آج کیا بات ہے تم اچھی اچھی باتیں نہیں کرتیں، بانو نے کہا، آپا جان' ابا موجود تھے تو یہ چاند اور ستارے کتنے چمکدار اور اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اب یہ کیوں نہیں چمکتے۔

جرمن خاتون نے یہ بھی بتایا کہ خود مرحوم کو بانو سے عشق تھا، چنانچہ بالکل آخری زمانہ حیات میں ڈاکٹر اقبال کا جی صرف بانو سے بہلتا اور بانو بھی مرحوم سے اس طور پر وابستہ ہو گئی تھی جیسے مرحوم اس کی ماں، اس کی ہمجولی اور اس کا کھلونا سبھی کچھ تھے۔ اسی سلسلہ میں خاتون کا بیان ہے کہ جب مرض نے نازک صورت اختیار کر لی اور مرحوم پر ضعف کی وجہ سے اکثر غفلت طاری ہو جاتی۔ تو ڈاکٹروں نے مریض کے کمرہ میں بانو تک کا آنا بند کر دیا۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ بانو نہیں معلوم کیسے ڈاکٹر صاحب کے کمرہ میں آگئی جہاں کوئی اور نہ تھا۔ میں پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ بانو ڈاکٹر اقبال کے سینہ پر بیٹھی ہوئی بے تکلف بات کئے جا رہی ہے۔ میں گھبرا اٹھی، سر اقبال کی جیناتی تقریباً

زائل ہو چکی تھی۔ میں نے دبے پاؤں قریب جا کر بانو کو بہلا کر جدا کرنا چاہا۔ سر اقبال بول بھی نہ سکتے تھے۔ بڑی ہی نحیف آواز میں کچھ ایسا کہا اور ان کی تقریباً بند آنکھوں میں کچھ ایسی جنبش ہوتی جیسے وہ چاہتے تھے کہ بانو کو ذرا دیر کے لئے جوں کا توں رہنا دیا جاتے۔ بانو کے اس طرح موجود ہونے سے جیسے ان پر ایک گونہ اطمینان ساطاری تھا اور زندگی کی ڈوبتی بجھتی ہوتی قندیل کو وہ اپنی جذبۂ امتنان و مسرت سے ایک لمحہ کے لئے اور اُجالے اور روشن کئے ہوئے رکھنا چاہتے تھے!

یہ خاتون اب بھی جب کبھی سر اقبال کا تذکرہ کرتی ہیں تو ان کے گریہ گلوگیر ہو جاتا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ میں نے ایسا مخلص اور شریف انسان نہ دیکھا۔ جب میں پہلے پہل پہنچی تو کھانے پر ڈاکٹر صاحب پورے کپڑے پہن کر آتے اور انہوں نے دسترخوان کے وہ آداب ملحوظ رکھے جو یورپ میں اونچے سے اونچے گھرانوں میں نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کو مجھ پر کچھ ایسا اعتماد ہوا کہ انہوں نے بڑی صفائی اور بڑے ہی لطف سے یہ خواہش ظاہر کی ان کو اس تکلیف سے مستثنیٰ کر دیا جاتے۔ یہاں تک کہ وہ صرف بنائن اور تہمد پہنے کھانے پر چلے آتے۔ جب تکلیف اور ضعف زیادہ بڑھا تو کمرہ ہی میں کھانا کھا لیتے۔ ان میں بھروسہ کرنے کا عجیب مادہ تھا۔ میری کسی تجویز کو انہوں نے کبھی رد نہیں کیا اور گھر کے معاملات میں مطلق دخل نہیں دیا۔ وہ اپنے عزیزوں سے زیادہ کہیں زیادہ میرا اعتبار کرتے تھے اور مجھے اس بات کا فخر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اکثر فرمایا کہ تمہارے ہونے سے مجھے گھر اور بچوں کی طرف سے ایسا اطمینان و آرام ہے جس کا میں بڑا متمنی تھا اور جس کی مجھے بڑی ضرورت تھی۔

دوسرے دن ایک عزیز کے ساتھ مرحوم کے مزار پر حاضر ہوا۔ شاہی مسجد کی پائیں بائیں سمت اس مردِ قلندر کو آسودہ خاک پایا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ اُس اقبال کی آرامگاہ ہے۔

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ جس نے
اور آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

میں نے محسوس کیا کہ بادشاہی مسجد کی پُراسرار و پُروقار ضخامت و قدامت اور اس کی مخصوص فضا اور روایات ذہن و دماغ پر اس درجہ اور اتنا جلد مستولی ہو جاتی ہیں کہ ذہن کسی دوسری طرف منتقل ہونے کے قابل ہی نہیں رہ جاتا چنانچہ میرے دل میں بے اختیار اور بار بار یہی آیا کہ اقبال کا مزار مستقل حیثیت سے کہیں اور ہونا چاہیئے تھا۔ جہاں اقبال کے تصور میں مزاحم ہونے والی کوئی اور چیز نہ ہوتی۔

اقبال زندہ تھے تو اطمینان رہتا تھا کہ کوئی نہ کوئی موقع نکال کر اُن سے مل آؤں گا اور اس کا یقین تھا کہ اُن سے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور معلوم ہو گی۔ جو میری ذہن کی استعداد کو شگفتہ کرے گی اور دل کے ولولوں کو بڑھائے گی۔ ذہن کی کچھ الجھنیں تھیں جن کے بارے میں یقین تھا کہ ڈاکٹر اقبال انہیں سلجھا دینگے۔ کبھی محنت و مطالعہ سے بچنے کے لئے دل کو بہلا لیا کرتا کہ دماغ پاشی کیوں کی جائے، کسی دن ڈاکٹر اقبال سے جا کر اپنا اطمینان کر لوں گا۔

جس وقت وفات کی خبر ملی تو معلوم ہوا کہ وہ تمام ذہنی تصورات جن میں بعض دھندلے تھے اور بعض گریزپا اور جن پر تعمیر کھڑی کر لینا میری زندگی کی کرامات میں سے ہوتا، اقبال کے اٹھ جانے سے سب کے سب درہم برہم ہو گئے۔ اب نہ وہ ولولہ رہا کہ ان کا پھر سے تعین کیا جائے اور نہ یہ امید کہ اقبال جیسا رفیق و رہبر ملے گا جو اُن کی تشکیل و تزئین میں مدد دے گا۔

اقبال کا ایک خاص وصف یہ بھی تھا کہ وہ اکثر ایسی باتیں بتا دیتے تھے اور اس طرح سے بتا دیتے کہ اس ایک بات سے بے شمار نئی نئی اور عجیب باتیں از خود برآمد ہونے لگتی تھیں اور کم سے کم مجھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں اُن کی اس ایک بات سے بہت سی دوسری باتیں نکال سکتا تھا۔ پھر لطف یہ کہ یہ دوسری باتیں اصل بات سے کوئی واسطہ براہ راست نہیں رکھتی تھیں اُن کی بتائی ہوئی باتیں نہ صرف نئے راستے کھول دیتی تھیں بلکہ ان راستوں پر مجاہدانہ و مجتہدانہ انداز سے گرم رفتار ہونا بھی آسان اور دلچسپ ہو جاتا تھا۔

اقبال دوسروں کے نزدیک کیسے ہی کچھ نہ ہوں میرے لئے تو وہ بہت کچھ تھے۔ میں تو یہاں تک سمجھتا ہوں کہ بہت سے مقامات پر وہ خود اپنے آپ کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اگر یہ شاعری ہے تو پیمبری کیا ہے؟ اور یہ پیغمبری ہے تو شاعری کا کیا درجہ ہے؟

احسن مارہروی مرحوم

عشق کوئی ہمدرد کہیں مدت میں پیدا کرتا ہے
کوہ رہیں گو نالاں برسوں لیکن اب فرہاد نہیں!   (میرؔ)

مولانا سید علی احسن صاحب احسنؔ مارہروی مرحوم کے ساتھ شعبۂ اُردو میں سالہا سال کام کرنے کا اتفاق رہا۔ اس دوران میں مرحوم کی صدہا خوبیاں ہم سب کے سامنے آئیں۔ شعبہ کو اُن سے بڑی تقویت تھی اور مسلم یونیورسٹی کے اندر باہر اُن کا نام بڑی عزت و محبت سے لیا جاتا تھا۔ ان کے خاندان کی بزرگی کا دُور و نزدیک شہرہ تھا۔ اُردو داں طبقہ میں وہ بڑی توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ زبان کے مستند عالم تھے اور اس بارہ میں اُن کے فیصلے اکثر و بیشتر بے چون و چرا تسلیم کیے جاتے تھے۔ مولانا قدیم مسلک شاعری کے پیرو تھے۔ زبان کی صحت کا بڑا لحاظ رکھتے تھے اور شاعری کی

اُن لوازم کی پوری پابندی کرتے تھے جو اُن کے پیش رووں سے ان تک پہنچی تھی۔ باایں ہمہ وہ اُردو ادب و شاعری کے جدید اسالیب اور جدید تصورات سے نہ بیگانہ تھے۔ نہ بیزار۔ اس نئے دبستان کے نقطۂ نظر کو پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ شاعرانہ کمال کی جی کھول کر داد دیتے تھے خواہ شاعر کا مسلک اُن کے مسلک سے بالکل جداگانہ ہی کیوں نہ ہوتا۔ اُردو میں مغربی انداز کی تنقید اُن کے سامنے مروّج و مقبول ہوئی۔ وہ خود اس کے پیرو نہ ہوئے لیکن اس قسم کے مباحث بڑی توجہ اور شوق سے سُنتے اور جہاں قائل ہو جاتے وہاں داد دینے میں ذرا تامّل نہ کرتے۔ اردو زبان یا شاعری پر خواہ کوئی بحث کرتا مولانا اس میں بڑے شوق و انہماک سے شریک ہوتے۔ اپنے خیالات و تصورات کے اظہار میں بڑے مخلص و دلیر تھے۔ دوسرے کے نقطۂ نظر کو توجہ اور صبر کے ساتھ سُننے میں بے نظیر تھے۔ اس اعتبار سے ان کو "ترقی پذیر" اور ترقی پسند قرار دینے میں تامّل نہ کرنا چاہیئے۔ ترقی پذیر یا ترقی پسند کا مفہوم آخر یہی تو ہے کہ جرأت کے ساتھ اپنی کہے اور صبر کے ساتھ دوسرے کی سُنے۔

رحلت کے وقت مرحوم کا سن چھیاسٹھ کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ جسم کے بھاری بھرکم تھے۔ ہر طرح کی سوسائٹی میں اپنی خوش دلی اور تواضع منشی سے مقبول تھے۔ علمی باتوں بالخصوص زبان و بیان کے مسائل کو منقّح کرنے کے بڑے دلدادہ تھے۔ جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کو دوسرے سے پوچھ لینے میں خواہ وہ اُن سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہوتا مطلق تامّل نہ کرتے تھے۔ ہم سب نے اکثر دیکھا کہ شعبہ میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ باتوں باتوں میں کوئی لفظ یا محاورہ ایسا آگیا جس کی صحت یا محل استعمال پر اختلاف آرا ہوا۔ فوراً اس کی ٹوہ میں لگ گئے۔ اکثر یہ محسوس ہوتا جیسے کھوئے کھوئے سے ہیں۔ بار بار حوالہ کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے۔ مطلب برآری نہ ہوتی تو بلا کسی لحاظ و تامّل کے حاضرین کو چھوڑ کر لائبریری چلے گئے۔ وہاں بھی کام نہ چلا تو کئی کئی دن اُسی اُدھیڑ بُن میں رہے۔ بالآخر بات واضح ہو گئی تو خوش خوش اس عمل کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو فرداً فرداً تحقیقات

کے نتائج بتاتے۔

اس بارہ خاص میں مولانا کی سرگرمی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کوئی علمی مسئلہ جو ان کو نہ معلوم ہوتا اس کے دریافت کرنے میں مولانا کی سعی وجستجو آج کل کے لوگوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ میں نے یہ بات جرمن پروفیسر کرنکو میں بھی پائی جو کچھ دنوں کے لئے مسلم یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ہو کر آتے تھے۔ پروفیسر کرنکو کے عالم متبحر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن ان کا بھی یہی عالم تھا۔ جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کا اقرار جلد سے جلد نہایت واضح الفاظ میں کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ وعدہ کرتے کہ دریافت کر کے بتائیں گے۔ جب بات منقح ہو جاتی تو ہر ایک کو بڑے لطف و اہتمام سے بتاتے۔

پروفیسر کرنکو اکثر یونیورسٹی لائبریری کے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ بوڑھے۔ ہنس مکھ۔ بات کرنے کے شائق۔ متوسط جسم، لمبا قد، عینک لگاتے ہوتے۔ اجنبی سے بھی اس طرح ملتے جیسے اس سے کافی واقف ہیں۔ جماعت اساتذہ کے اکثر لوگ تھوڑی دیر کے لئے ضرور لائبریری پہنچتے ہیں۔ پروفیسر کرنکو کو کسی نہ کسی علمی بحث پر ضرور گفتگو کرتے اور ہر شخص کو فرداً فرداً مخاطب رکھتے ہوتے پاتا۔ گفتگو کے دوران میں کوئی آجاتا تو اُسے مخاطب کر کے جس حد تک بحث ہو چکی ہوتی۔ اس کا خلاصہ سُنا کر آگے بڑھتے مجھے یاد ہے ایک بار (Model de Luxe) کے تلفظ پر بحث چھڑ گئی۔ پروفیسر کرنکو نے فرمایا کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ بہت کم لوگ کر پاتے ہیں۔ پھر اس کا صحیح تلفظ اپنے ہونٹوں کو ایک خاص شکل دے کر بتایا اور اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ فرداً فرداً ہر شخص سے صحیح تلفظ کرایا۔ اس وقت حاضرین کی تعداد سات آٹھ آدمیوں سے کم نہ تھی!!

باہر سے اکثر استفسارات آتے رہتے اور یہ تمام تر احسن مرحوم ہی کے سپرد کئے جاتے۔ ان پر وہ بڑی محنت کرتے اور بڑی جستجو و تحقیق کے بعد جواب مرتب فرماتے۔ سند میں اساتذہ کے شعر فی الفور

پڑھتے۔ کہتے تھے استاد داغ مرحوم کے آخری دَور میں ان کے حلقہ میں بیٹھنے والوں کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ الفاظ کی تذکیر تانیث یا محلِ استعمال کے بارہ میں استاد سے فرمائش کرتے رہتے کہ وہ اُن الفاظ کو اشعار میں استعمال کر دیں۔ استاد اس فرمائش کو بڑی خوشی سے پوری کرتے۔ اس سے داغ مرحوم کے شاگردوں میں تحقیق الفاظ اور محل استعمال سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ جو استفسارات باہر سے شعبہ اردو میں آتے اُن پر مرحوم کا محاکمہ بڑے معرکہ کا ہوتا۔ وہ اس قسم کی بحث میں لفاظی کو دخل نہ دیتے بلکہ بڑے بڑے سند دلائل اور حوالے پیش کرتے۔ اکثر استفسار کرنے والے بعد میں لکھتے کہ مولانا مرحوم ہی کا فیصلہ قول فیصل قرار دیا گیا۔

مرحوم کے پاس اردو کتابوں کا بہت اچھا اور بیش قیمت ذخیرہ تھا۔ کتابیں بڑے شوق و محنت سے جمع کرتے۔ کہتے تھے دو چوریاں جائز ہیں۔ ایک دل کی اور دوسری کتاب کی۔ مولانا کی خدمت میں ہم سب بہت بے تکلف اور شوخ تھے۔ مرحوم بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے میں تامل نہ کرتے۔ مولانا کی صحبت میں ہر مذاق اور ہر عمر کے لوگ موجود ہوتے، اُن کے خلوص اور شگفتگی کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص مرحوم کی باتوں سے اپنی اپنی جگہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ بوڑھوں میں وہ ایسے نظر آتے تھے جیسے بوڑھے خود ان کو بزرگ سمجھتے ہیں۔ نوجوان اور بچوں میں ایسے معلوم ہوتے جیسے اُن میں ان سے زیادہ دلچسپ کوئی اور نہیں۔ لیکن ایک چیز ایسی تھی جس کی ان کو تاب نہ تھی یعنی زبان کی غلطی کہیں سُن لوں۔ ساری عمر اسی میں گزاری۔ زبان و بیان میں کہیں کوئی سقم دیکھ پاتا سُن پاتا ہوں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا۔ مولانا کی اس بات پر ہم سب خوب ہنستے لیکن وہ اس بارہ میں کبھی تکلف یا تامل سے کام نہ لیتے۔ ایک دن شعبہ اردو میں ایک صاحب تشریف لائے۔ یہ گورداسپور میں ریلوے میں ملازم تھے۔ مسودات کا بستہ ساتھ تھا۔ اردو شعرا کا ایک مبسوط تذکرہ مرتب فرما رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہوتے کہ غریب نے ملازمت کے کس محکمہ میں کی اور کام کیا شروع کر رکھا ہے۔ ہم سب نے ان کے کاموں سے بڑی دلچسپی

کا اظہار کیا اور ان کی محنت کی داد دی۔ اسی اثنا میں مرحوم تشریف لائے۔ نو وارد سے نہ کسی قسم کی ہمدردی کی نہ تعرض۔ کچھ دیر بعد مہمان عزیز نے مولانا کی قصیدہ خوانی شروع کی۔ ہم سب نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور مولانا پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ مسودہ کی طرف مائل ہوں۔

مولانا نے مطلقاً التفات نہ کیا اس سے نہ تو نو وارد کی دلجمعی ہوئی اور نہ حاضرین کو تفریح۔ مہمان کا اصرار تھا کہ مولانا بھی کوئی مشورہ دیں۔ حاضرین نے بھی شہ دی۔ مولانا نے کسی قدر اکتا کر مسودہ کو بالکل یونہی ایک جگہ سے کھولا اور دو چار سطریں پڑھ کر فرمایا۔ یہ کہاں کی اُردو ہے اور یہ کیا خرافات لکھ مارا ہے۔ جاؤ اسے ٹھیک کرو۔ یہ کہہ کر مسودہ واپس کر دیا اور دوسری طرف مخاطب ہو گئے۔ اجنبی نے دبی زبان سے عرض کیا حضور اسے ٹھیک کر کے کب حاضر ہوں۔ مولانا نے بغیر ان کی طرف رُخ کئے ہوئے جواب دیا۔ دس برس بعد! اجنبی کو بڑی مایوسی ہوئی، تھوڑی دیر بعد بڑے مایوس لہجہ میں عرض کیا۔ دس برس بعد تو بڑی ہو تی۔ مولانا نے فرمایا تو میں کیا کروں مجھے تو اس کام میں چالیس سال لگ گئے پھر بھی پڑھے لکھے لوگوں کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ آپ کا کیا۔ کاتا اور لے دوڑے۔

مولانا کی اس بے رخی سے ہم سب بھی خفیف ہوتے۔ میں نے عرض کیا مولانا یہ بھی معلوم ہے یہ آپ کن صاحب کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ فرمایا کون صاحب ہیں؟ میں نے کہا آپ ریلوے میں ملازم ہیں۔ فرمایا وہ تو میں سمجھ گیا۔ میں نے کہا چاہیں تو بے ٹکٹ سفر کرنے والوں کو نہ پکڑیں اور چاہیں تو چلتے سفر میں بلوا دیں!

مولانا بے ساختہ ہنس پڑے اور نو وارد سے بہت کچھ التفات فرمایا اور یہ بات بڑی خیر و خوبی سے ختم ہو گئی۔

مولانا کے دل میں نہ کینہ رہ سکتا تھا نہ راز۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے دل میں ان کی سمائی نہیں۔

اس سے میں نے بہت نقصان اٹھائے لیکن کیا کروں۔ شاید یہ شاعری کی مار ہے کہ دل میں بات نہیں رکھ پاتا۔

ایک بار ایک دوست نے مولانا کو اپنا انتہائی رازداں سمجھ کر ایک معاملہ میں شریک کار بنایا تھوڑے ہی عرصہ بعد مولانا میرے پاس آئے۔ عجیب حیص بیص میں مبتلا تھے۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی راز ہے جو اپنی بدہضمی سے مولانا کے دل میں جاگزیں ہو گیا ہے اور بقول غالب "سینۂ بسمل سے پرافشاں" نکلنا چاہتا ہے۔ میں نے عمداً دوسری باتیں شروع کر دیں۔ مولانا سنی ان سنی کرتے جاتے تھے اور جب انہیں یقین آنے لگا کہ میں کسی طرح ان کی ہمت افزائی کرنے پر آمادہ نہیں ہوں تو انہوں نے بے اختیار ہو کر اپنے بھاری بھرکم جسم کو اس طرح تولا یا اس سے اپنے آپ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی جیسے گرمی میں کوئی شخص اپنے لباس کو جسم سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور تنگ آن میں آکر پھونکیں مارتا ہے۔ ایک دفعہ ادھر ادھر دیکھ کر کہ کوئی غیر تو موجود نہیں ہے اپنی کرسی میری کرسی سے قریب کر لی اور کچھ کہنا چاہا۔ میں ان کے ارادہ سے واقف ہو گیا۔ میں نے بھی ایک لمبا سانس لے کر اپنی کرسی ان سے اتنی ہی دور کر لی جتنی انہوں نے قریب کی تھی۔ مولانا کچھ ایسے ذہنی خلفشار میں مبتلا تھے کہ انہوں نے میری بے تمیزی کا مطلق خیال نہ کیا۔ اور نفس مضمون پر آنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ میں سمجھ گیا کہ مولانا اس دفعہ پسپا نہ ہوں گے۔ چنانچہ میں نے روک تھام کی بجائے راہ فرار اختیار کی اور اٹھ کر بھاگا۔ مولانا بآں جسد عنصری میرا تعاقب بھی نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے بیٹھے ہی بیٹھے فرمایا۔ رشید صاحب ارے وہ بھی سنا۔ میں بھاگنے کی سائنس و آرٹ یعنی (REAR GUARD ACTION) ریر گارڈ ایکشن (رننگ پسپائی) سے پوری طور پر واقف تھا۔ میں نے بھاگتے ہوئے جواب دیا جی ہاں

؎۱ اس سلسلہ میں غالب مرحوم کا ایک شعر آپ کو یاد ہوگا ؎

اہل ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق — جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے

مولانا میں ابھی آتا ہوں۔ مولانا نے دیکھا کہ شکار نکلا جاتا ہے۔ میں دروازہ سے نکل جانے والا ہی تھا کہ مولانا نے جان پر کھیل کر آخری گولی چلا ہی دی۔ میں گر گیا۔ مولانا نے راز فاش کر دیا تھا!

مولانا کا خاندانی تعلق سادات بلگرام سے تھا۔ سید شاہ برکت اللہ علیہ الرحمۃ سترھویں صدی کے آخر یا اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں بلگرام سے مارہرہ تشریف لاتے اور اس خاندان کے بانی ہوئے چنانچہ مرحوم کی خاندانی عظمت و وقار کا ہر چھوٹا بڑا معترف ہے علم و فضل کو اس گھرانے سے بڑا دیرینہ اور گہرا تعلق رہا ہے اور خاندان و خانقاہ برکاتیہ کا نام دور دور تک مشہور ہے۔ مرحوم کو اپنے خاندانی وقار و روایات کا بڑا احساس تھا اور اس کے تحفظ اور رکھ رکھاؤ میں حتی الوسع کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ ہر ملنے والے سے بڑی تواضع اور محبت سے ملتے تھے وہ بہت جلد بے تکلف بھی ہو جاتے تھے لیکن سفلگی اور بے تمیزی کے کبھی روادار نہ ہوتے۔

اس کی سب سے نمایاں مثال اس وقت نظر آتی جب مولانا کے گھر پر چھوٹے چھوٹے بچوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا۔ مولانا کو بچوں سے بڑی الفت تھی اور بچے بھی ان سے اس طور پر وابستہ رہتے جیسے مولانا ان کا کھلونا تھے۔ جب کوئی بچہ آتا اور مرحوم کے پاس کوئی ملاقاتی بیٹھا ہوتا۔ تو بچے نہایت احترام سے جھک کر آداب بجا لاتے اور جو کچھ کہنا ہوتا مولانا کے قریب جا کر آہستہ سے کہتے۔ ایسے وقت مولانا بھی ان بچوں کا بڑا احترام کرتے اور جلد سے جلد نہایت لطف و شفقت سے ان کی طرف مخاطب ہو جاتے اور ایسا ظاہر کرتے گویا بچے کی آمد کو بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے ہر بچہ کا یہی وطیرہ تھا۔ بچوں کا لباس اور وضع قطع بالکل قدیم زمانہ کی ہوتی۔ سفید ستھرے کرتے پاجامے، سر پر بال باریک ترشے ہوتے۔ پاؤں میں جوتا۔ سر پہ ٹوپی۔ چلنے پھرنے ہنسنے بولنے میں ایک طرح کی شستگی و شائستگی پائی جاتی تھی۔

آج کل کے نوجوانوں اور بچوں میں سر پر طرح طرح کے بال رکھنے اور سنوارنے، ننگے سر پھرنے

یا انواع اقسام کے نگ اور نگینیں پہننے کا جو عام رواج ہے اور جسے شادی کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔
مولانا کے ہاں کے بچے ان سے بہت دور تھے۔ بعض لوگ اس پر کہہ اٹھیں گے کہ یہ قلِ اعوذیت تھی۔
قلِ اعوذیت کا میں بھی قائل نہیں ہوں لیکن نسوانیت یا شہد پن کے مقابلہ میں قلِ اعوذیت کو گردن زدنی
بھی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ لباس و جسم کی تزئین میرے نزدیک صرف عورتوں کے لئے مباح ہے۔
اس مسئلہ پر یہاں میں نہ مردوں سے لڑنا چاہتا ہوں اور نہ عورتوں سے بگاڑ کرنا پسند کرونگا۔
البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اگر زندگی کا اپنے اور دوسروں کے لئے انفرادی یا مجموعی طور پر نفع رساں ہونا
ہی زندگی کا اصلی مقصد ہے تو میرا خیال ہے کہ یہاں تک وضع قطع، رہن سہن، مرنے جینے، نفع یابی
و نفع رسانی کا تعلق ہے پرانے لوگ نئے لوگوں سے کسی طرح خسارہ میں نہیں ہیں۔ نہ ان کو ملزم قرار
دیا جا سکتا ہے اور نہ اُن پر ترس کھانے کی ضرورت ہے۔ نئی زندگی و نیا زمانہ مجموعہ صد کرامات سہی
لیکن میں تو کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پرانی زندگی جو مدت الایام کے جبر و ترک کا حاصل اور جو کرامت
نہیں، ریاضت کا ثمرہ تھی انسانوں اور انسانیت کے لئے زیادہ با معنی اور زیادہ باعث خیر و برکت ہے۔
مرحوم پرانی دنیا کے آدمی تھے اور ان کی زندگی کی کشتی کے بندھن اور چولیں سب پرانی ہی تھیں۔
لیکن وہ نئے دور کے طوفان میں ان لوگوں سے زیادہ کامیاب اور زیادہ نفع رساں تھے جن کے پاس
جدید ترین کشتیاں اور جدید ترین آلات و علوم تھے، مرحوم سے جن لوگوں کو ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے۔
وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ کسی محفل اور کسی موقع پر بند نہ تھے ہر جگہ ان کی پذیرائی خوشدلی
سے کی جاتی تھی اس کے علاوہ وہ بڑے دوست پرست اور کنبہ پرور تھے۔ ہر طرح کے لوگوں کی ہر
طرح سے مدد کرتے رہے۔

اس سلسلہ میں وہ زیر بار بھی بہت ہو گئے تھے اور تقریباً ساری آبائی ملکیت ہاتھ سے نکل
چکی تھی۔ تنگ حالی سے اکثر پریشان رہتے تھے اور دوستوں، عزیزوں اور حاجت مندوں

کی جیسی مدد کرنا چاہتے تھے نہیں کر سکتے تھے اس کا ان کو دلی رنج تھا لیکن وہ اپنی جیسی کر گزرنے میں
کبھی تامل بھی نہ کرتے تھے۔ وہ جس طرح دوستوں کی مدد کر چکے تھے اسی طرح لیکن اس سے کہیں کم وہ
دوستوں سے مدد کے متوقع رہتے تھے اور حاصل بھی کر لیتے تھے۔ اس پر ہم سب کبھی اُن پر فقرے بھی
چست کرتے تھے۔ ایسے ہی موقع پر ایک بار فرمایا۔ بھائی دیکھو تو جب میرے پاس کچھ تھا تو میں نے
دوستوں اور حاجت مندوں کو بہت کچھ دیا اب جب کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے تو اپنے جسم و جان کو
اکٹھا رکھنے میں تماشائے اہل کرم دیکھنا چاہوں تو معترض کیوں ہوتے ہو!

مرحوم شاعری کے قدیم دبستان کے پیرو تھے۔ ساری عمر شعر و شاعری، تصنیف و تالیف تحقیق
و تدقیق میں گزاری۔ اپنے اُستاد کے مسلم الثبوت پیرو تھے۔ لیکن کلام میں اُستاد جیسی اچھوتی جیتی جاگتی
شوخی رنگینی و جدت آفرینی نہ تھی اور واقعہ یہ ہے کہ بڑے شاعر کی طرح داغ نے بھی اپنا ثانی پیدا ہونے نہ
دیا۔ لیکن فن شاعری میں مرحوم کا پایہ نہایت اونچا تھا۔ زبان محاورہ و مصطلحات و متعلقات شاعری کے
سمجھنے، پرکھنے اور برتنے میں مرحوم بے مثل تھے۔ ایسے لوگ اب خال خال رہ گئے ہیں اور جلد جلد اُٹھتے جا
رہے ہیں۔ صحت زبان و مصطلحات شاعری کی پیروی اب کون کرتا ہے کس کو فکر و فرصت ہے اور کوئی
کرے بھی تو کس برتے پر کرے۔ شاعر ہم ہیں اب بھی اچھے سے اچھے موجود ہیں اور پیدا ہوتے رہتے
ہیں لیکن فن کے واقف کار کہاں۔ فنی تبحر بڑی اہم چیز ہے شاعری زبان و بیان ہی کے منتروں میں جادو
جگاتی ہے۔ اس لئے زبان و بیان کے مبصر و معیار کو ہم کبھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔

مولانا جیسا قادر الکلام اور بسیار گو شاعر میری نظر سے کم گزرا ہے۔ شعر کہنا اُن کے نزدیک
اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ نثر لکھنا۔ کئی سال ہوئے دکن کے ایک اخبار میں چند مضامین شائع ہوئے
جو اعلیٰ حضرت خسرو دکن کے خورد سال جگر گوشہ کی غیر متوقع سانحہ وفات پر ہوش بلگرامی نے لکھے تھے اور جن میں
بعض فقرات نثری بھی شامل تھے۔ مولانا احسن مرحوم نے ان مضامین کو مثنوی کے پیرایہ میں قلمبند کرنا شروع کیا تمام نہ ہوا تھا کہ شعبہ اردو

میں بیٹھے ہوئے ہیں، ہر طرح کے طلباء اور رفقائے کار سے گفتگو بھی جاری ہے، علمی بحثوں میں حصہ لے رہے ہیں۔
ہنسی مذاق میں بھی شریک ہیں۔ اور مثنوی بھی لکھی جا رہی ہے۔ مشکل سے تین چار دن گزرے ہوں گے۔
کہ مثنوی مکمل ہو گئی۔ مولانا کی مشکلات اور ان کے شاعرانہ کمال کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے، جب
اصل مضامین جن سے یہ مثنوی (موسوم بہ شاہکار عثمانی) لفظاً و معناً ماخوذ ہے پیش نظر ہوں۔

ایک دن شعر و شاعری پر بحث ہو رہی تھی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے برسبیل تذکرہ
فرمایا کہ اصغر گونڈوی مرحوم (جو اس وقت زندہ تھے) کی شاعری کا میں اس وقت قائل ہوں گا۔
جب مصرعہ طرح دے دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ سامنے بیٹھ کر غزل مکمل کر دیں۔ مولانا مرحوم
یہ سن کر آپے سے باہر ہو گئے۔ آواز میں لکنت تھی اس لئے جب کبھی جوش میں آ جاتے تھے تو ان
کا لب و لہجہ نہایت درجہ دلچسپ ہو جاتا تھا۔ ململ کا ڈھیلی آستین کا کرتا پہنے آرام کرسی پر لیٹے ہوئے
تھے۔ فوراً اٹھ بیٹھے۔ آستین چڑھالی اور بڑے ہی کڑے تیور سے بولے۔ میاں ہوش میں آؤ۔ یہ
کیا بک گئے۔ شاعر کو یوں پہچانتے ہیں؟ اصغر کو تمہارے فرشتے بھی نہیں پہچان سکتے۔ جس کو تم
شاعر سمجھتے ہو اس مسخرے کو میرے پاس لاؤ اور اس کی ٹانگ میری ٹانگ سے باندھ دو اور ہم
دونوں کے سر پر پٹیں تابڑ توڑ جوتے اس وقت مصرعہ طرح دو۔ پھر دیکھیں کون کتنے پانی میں ہے۔

مولانا کی برہمی کا یہ منظر بھی دیکھنے کے قابل تھا جب کسی قدر دھیمے پڑے تو میں نے عرض کیا
مولانا آپ مسلم یونیورسٹی کی انجمن حدیقۃ الشعر کے صدر ہیں۔ اگر یہ تجویز آنجناب آئندہ سے نافذ کر
دیتے جائیں تو کیا ہو۔ مرحوم قہقہہ مار کر کرسی پر لیٹ گئے۔ کہنے لگے، بڑا اچھا ہو۔ کم بخت
گوتوں سے نجات ہو جائے۔

مسوری جانے والوں کو معلوم ہے کہ وہاں "فصل" میں کس کس قسم کے وحوش و طیور کہاں
کہاں سے کھنچ کر آتے ہیں اور صید و صیاد، دانہ دام، تمنا و تماشا کی کیسی کیسی نیرنگیوں سے

سابقہ ہوتا ہے۔ یہاں ایک سالانہ مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ ایک مشاعرہ میں مولانا بھی شریک تھے۔
سامنے کی صف اوّل میں وہ سب کچھ تھا جس کی ترجمانی ایک شعر میں ہوتی ہے جو میرے بچپن میں
یکّہ بانوں میں بہت مقبول تھا اس کا ایک مصرعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ ع

کہاں لے جاؤں دل دونوں جہاں میں سخت مشکل ہے

مولانا کی باری آئی بھلے مانسوں کے سیدھے سادھے لب و لہجہ میں یہ رباعی پڑھی

؎ سازندوں کے انداز کہاں سے لاؤں — بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں
فرمائیں معاف نوجوانانِ سخن — بوڑھا ہوں نیا ساز کہاں سے لاؤں

سننے والے اچھل پڑے اور مجمع میں ایک ہمہمہ سا پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد طرح میں غزل
پڑھنی شروع کی۔ جس کے اس شعر پر جو صف اوّل کو مدِّ نظر رکھ کر پڑھا گیا مجمع سے وہ نعرۂ
تحسین و تہنیت بلند ہوا کہ دیر تک کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی ؎

بٹتی ہے امیروں میں ترے حسن کی دولت — یہ مصرفِ خیرات سمجھ میں نہیں آتا

مرحوم کو مشاعرہ منعقد کرنے کا بڑا شوق تھا۔ بڑے لطف و انہماک سے اس کا اہتمام
کرتے تھے اور شعراء و مہمانوں کی پذیرائی اس طور پر کرتے جیسے خود مولانا ہی کے ہاں کوئی تقریب
منعقد ہے۔ مولانا کے دم سے وہ ایک دن بڑی چہل پہل کے گزرتے۔ ہر شاعر کا پورا پورا حفظِ
مراتب ملحوظ رکھتے جس سے ہر شخص بہت مسرور و مطمئن رہتا۔

اسی سلسلہ میں ایک بار مولانا کے پاس بمبئی سے مشاعرہ میں شرکت کا ایک دعوت نامہ آیا۔
چنانچہ رخصت لے کر بمبئی گئے۔ وہاں احباب اور قدر دانوں کا اصرار اتنا بڑھا کہ رخصت سے
زائد ایک دن وہاں ٹھہرنا پڑا۔ توسیع رخصت کی درخواست کی۔ اس زمانہ میں یہاں
پرو وائس چانسلر ایک انگریز تھے جن کی سیرت کا عجیب پہلو یہ تھا کہ وہ بغیر کسی طرح کا نوٹس

دستے ہر بات پر یا تو نہایت درجہ مسرور و متواضع ہو جاتے یا نہایت درجہ بیزار و برہم۔ ان کے ہاں بیچ کا کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ مولانا کی عدم حاضری پر سخت برہم ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے مولانا کے ساتھ ساتھ شعبۂ اُردو کی بھی خبر نہیں میری طلبی ہوتی۔ مکالمہ سُنیئے۔

صاحب (لال بھبوکا ہو کر اور مع کرسی میری طرف رُخ کر کے) یہ کیا لغویت ہے؟

میں (متعجب و سراسیمہ ہو کر) غالباً آپ کا مطلب میرے علاوہ کسی اور سے ہے، جناب؟

صاحب (تقریباً دانت پیس کر) بے شک۔ مولانا صاحب نے کیوں درخواست دی، ان کو کیا حق تھا اپنے فرائض سے انہوں نے غفلت برتی!!

میں۔ جناب والا مجھے بالکل نہیں معلوم کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ کوئی غیر معمولی بات ہوگی ورنہ بظاہر مولانا صاحب اس قسم کے آدمی نہیں معلوم ہوتے جو اپنے حقوق یا فرائض کو ویسا ہی نہ سمجھتے ہوں جیسا کہ سمجھنا چاہئے۔

صاحب (نہایت غصہ ناک لہجہ میں) میں کہتا ہوں وہ آخر گئے کیوں؟

میں۔ شعر پڑھنے!

صاحب۔ شعر!

میں۔ شعر، جناب والا!

صاحب۔ اپنے شعر؟

میں۔ مولانا سے توقع تو یہی کی جاتی ہے۔

صاحب۔ لیکن یہ ہوا کیا؟

میں۔ ہوتا ہوانا کچھ نہیں عالی جاہا، لیکن مانتا کوئی نہیں۔

صاحب۔ تم شعبہ کے انچارج ہو۔ اس کا انسداد کیوں نہیں کرتے؟

میں۔ جناب والا میں نالائقی تسلیم کرتا ہوں لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ مولانا تشریف لائیں تو جناب ان سے بھی گفتگو فرما لیں۔ بہت سی باتیں واضح ہو جائیں گی۔

صاحب۔ بہت خوب، مولانا صاحب کو میرے ہاں لانا (کسی قدر زہرخند فرما کر) مجھے اب تک ان سے ملنے کی مسرت بھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔

پرو وائس چانسلر صاحب کو اطلاع کی گئی۔ فوراً طلبی ہوئی میں اور مولانا حاضر ہوئے۔ مولانا کو دیکھ کر صاحب یک لخت جھجکے اور فوراً ہی سروقد ہو کر مولانا کو تعظیم دی۔ انتہائی گرم جوشی کا اظہار کیا۔ مزاج پرسی فرمائی۔ پذیرائی میں بچھ بچھ گئے۔ گفتگو بالکل نہ ہوئی۔ میرا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ البتہ یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ کورنش بجا لانے میں زیادہ اہتمام مولانا کی طرف سے ہے یا صاحب کی طرف سے۔ یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ دونوں سروقد کھڑے ہو گئے۔ میں یہ سمجھا کہ اب وداعی معانقہ ہوگا لیکن مصافحہ پر یہ صحبت ختم ہو گئی۔

مرحوم سے کلاس میں اکثر طلبا شوخیاں بھی کرتے تھے۔ مولانا کے پڑھانے کا انداز قدیم طرز کا تھا۔ وہ ہمہ تن معلم بن کر پڑھاتے تھے۔ اور طالب علموں سے ان آداب کی توقع رکھتے تھے جو خود مرحوم نے اپنے استادوں کے ساتھ مکتب میں ملحوظ رکھے تھے۔ وہ بات اس زمانہ میں کہاں۔ ایک دن دیکھا کہ مولانا کلاس سے سخت آزردہ و برہم چلے آ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں طلبا بھی آ گئے۔ معلوم ہوا کہ بعض طلبا کلاس میں سکوت و سکون قائم نہیں رہنے دیتے تھے۔ مولانا کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور کلاس سے چلے آئے۔ معاملہ رفت گزشت ہوا۔ کچھ دیر بعد اس مسئلہ پر مولانا سے گفتگو ہوئی۔ فرمایا۔ رشید صاحب! طلبا پڑھنے نہیں آتے۔ وقت گزاری اور تفریح و تفنن کیلئے

آتے ہیں۔ یہ دُنیا میں جو چاہیں کر لیں علم نوازوں کو آنے کا نہیں! میں نے عرض کیا مولانا، آپ کا فرمانا
بالکل صحیح ہے لیکن کیا کیجیے گا۔ یہ طلبا کا قصور نہیں ہے۔ دُنیا کا ہی رنگ ہے جو باتیں ہمارے
آپ کے زمانہ میں قدر و قیمت رکھتی تھیں۔ وہ اب مردود ہو چکی ہیں بحفظ مراتب اُٹھ چکا ہے۔
یہ زمانہ احتساب نفس کا نہیں ہے مطالبات نفس کا ہے۔ کڑھیے نہیں۔ لڑکوں کو معاف کر دیجیے۔
ان کو معلوم نہیں وہ کیا کر رہے ہیں اور کن اثرات کے شکار ہیں۔ مرحوم کو اطمینان نہیں ہوا، بولے
جی نہیں۔ میں نالائقوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا مجھے کوئی دوسرا کلاس دیجیے۔ مولانا کی
اس برہمی سے میں لطف اندوز ہوا۔ میں نے عرض کیا۔ مولانا فرض کیجیے یہ لڑکے بڑے نالائق ہیں۔
آپ شوق سے دوسرا کلاس بھی لے لیجیے لیکن ایک بات مجھے سمجھا دیجیے۔ آخر ہم آپ چھوٹوں
ہی کی نالائقی پر کیوں برہم ہوتے ہیں اور بڑوں کی نالائقی انگیز کرتے ہیں۔ مولانا دھیمے پڑ گئے
اور کسی قدر مدہم سروں میں انا للہ۔ پڑھ کر جلد ہی دوسری باتوں میں لگ گئے۔

مولانا کو چائے سے عشق تھا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ صرف شکر کھانے کا بہانہ تھا۔
نصف پیالی شکر اور نصف چائے۔ اسی طرح آموں کے بھی بڑے شائق تھے۔ برسات میں پھنسیوں
سے ڈر جاتے تھے۔ لیکن آم اور شکر کا ترک کرنا تو درکنار کم کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے ذیابیطس
کے پرانے مریض تھے۔ لیکن اس کی بالکل پروا نہ کرتے تھے۔ اس وضع داری نے کاربنکل سے
دوچار کیا اور کاربنکل نے انہیں ان کے پیدا کرنے والے سے جا ملایا۔

مرحوم مقررہ میعاد ختم کر کے ملازمت سے سبکدوش ہوتے تھے لیکن اس سن و سال
کے باوجود وہ اتنا کام کر لیا کرتے تھے۔ جو اُن سے بہت کم عمر والوں کے لئے مشکل تھا۔ اُن کے قوائے
ذہنی و جسمانی پورے طور پر استوار و بیدار تھے۔ شگفتگی و زندہ دلی کا دامن کہیں سے چھوٹنے نہ پایا
تھا۔ رندوں میں رند، پارساؤں میں پارسا، خردوں میں خرد، بزرگوں میں بزرگ، کیسے کیسے زمانے،

کیسی کیسی محفلیں اور صحبتیں دیکھے اور برتنے ہوتے۔ یہ ہمہ جہت شخصیت بالآخر ۲۰ر اگست ۱۹۴۰ء کو جمعہ کے دن آغوشِ رحمت میں پہنچ گئی۔

اگست ۱۹۴۰ء کا غالباً پہلا ہفتہ تھا۔ مکان سے یونیورسٹی آ رہا تھا کہ خبر ملی مولانا احسن کاربنکل کی اذیت میں مبتلا ہیں۔ مولانا کی اقامت گاہ پر پہنچا تو شدید کرب میں مبتلا پایا۔ مرحوم دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ابھی پورے طور پر سلام و پیام بھی نہیں ہوا تھا۔ کہ بے اختیار ہو کر بولے اور کیوں حضور سنتا ہوں خمخانہ شائع ہو گئی۔ میرا نسخہ کہاں ہے۔ ہر ایک سے پوچھتا ہوں کوئی نشان نہیں دیتا۔ خدارا تھوڑی دیر کے لئے اپنا ہی نسخہ بھیج دیجیے۔ پڑھ کر واپس کر دوں گا۔

کہاں مرض الموت کا یہ کرب۔ کہاں ایک معمولی سی کتاب کی طلب۔ اللہ اکبر! میں مبہوت ہو گیا اور ایک لمحہ کے لئے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان و زمین کی ساری پہنائیوں پر مریض کی شخصیت مستولی ہو گئی ہے۔ میں تھوڑی دیر تک دم بخود رہا لیکن مرحوم پھوڑے کی مسلسل ٹیس سے ذرا نجات پاتے تو یہی کہتے رشید صاحب خدارا کتاب بھیج دیجئے۔ میں آدمی ساتھ کر دیتا ہوں وہ لائے گا۔ دل کی لگن اسے کہتے ہیں! عجب اتفاق کہ کتاب نہ میں بھیج سکا اور نہ مولانا کو مل سکی +

(میاں محمد حنیف پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں باہتمام ملک محمد عارف خاں پرنٹر چھپوا کر اُردو اکیڈمی [illegible] سے شائع کیا)